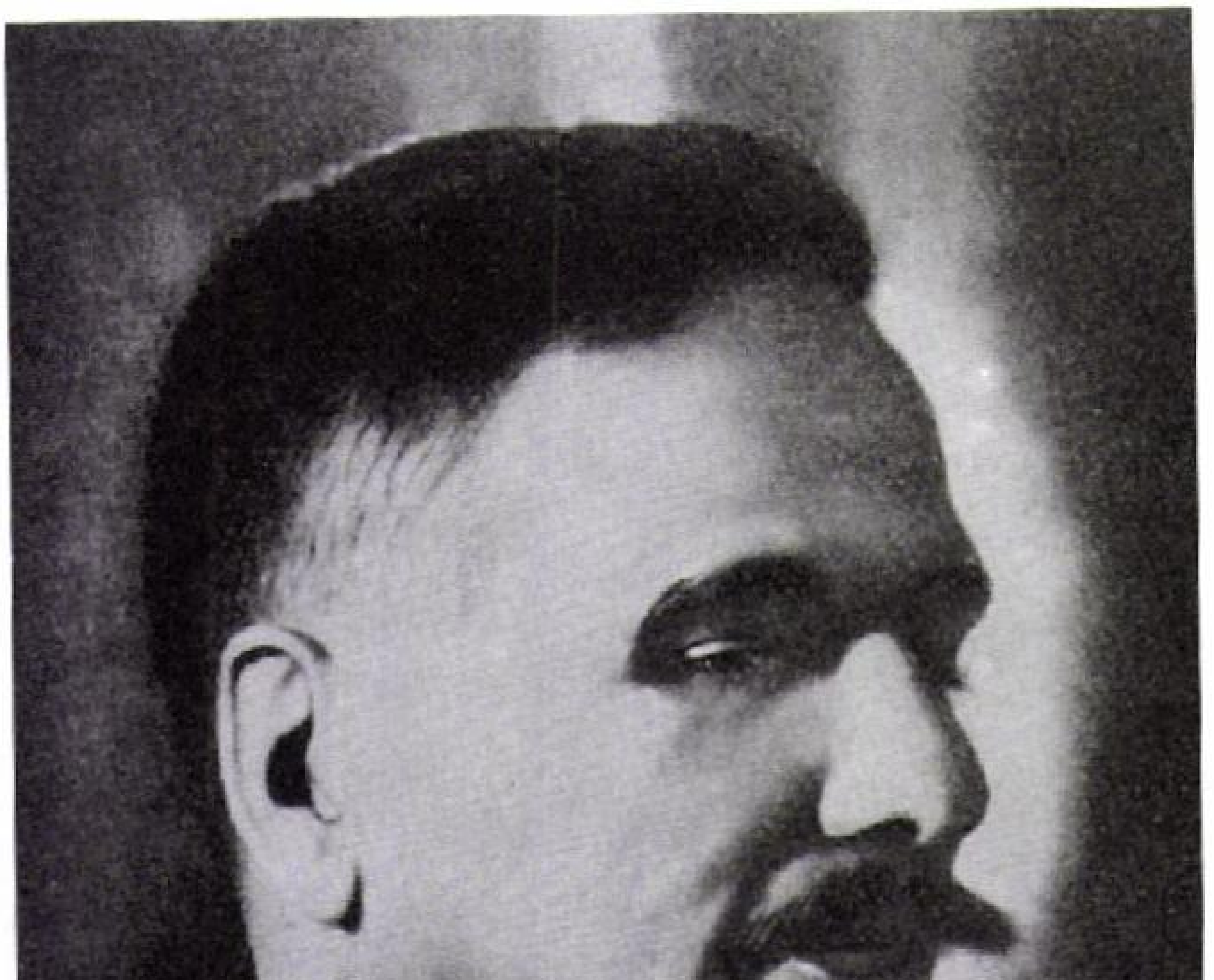

شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال

# علّامہ ڈاکٹر محمد اقبال

## شاعرِ مشرق

''اقبال کی موت سے ادب کی دنیا میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جو ایک جان لیوا زخم کی طرح اچھا ہونے اور پوری طرح بھرنے میں بہت وقت لے گا۔'' یہ تھے وہ الفاظ جو ایک اور عظیم الشّان شاعر، ان کے ہندوستانی ہم عصر اور ہم رُتبہ نوبیل انعام یافتہ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے ڈاکٹر محمد اقبال کے بارے میں اس وقت کہے تھے جب ۱۹۳۸ء میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ یہ بہت بڑے الفاظ تھے ایسے انسان کے لیے جس کو اپنی زندگی میں ہی بامِ شہرت مل گیا تھا اور جس کو ایشیا کے اور بالخصوص ہند اسلامی فارسی کے روحانی گنبدِ افلاک کے ایک بڑے ستارے کا مقام حاصل ہو گیا تھا۔ ان کے ایک جرمن دوست اور مستشرق نے اقبال کو ''ایک فلسفی اور ماورائی اہمیت کا شاعر'' کے الفاظ سے یاد کیا تھا۔ اور اس کے باوجود کہ ساری دنیا کے لوگ آج بھی اس کو شاعرِ مشرق کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جس کو تمام پاکستانی ملک کا ''روحانی بانی'' سمجھتے ہیں اقبال نے 'ظاہری زندگی ایسی گزاری جس کے بارے میں بہت کم کہا جاسکتا ہے اور باطنی زندگی ایسی جس کے بارے میں لوگوں کو بہت کم علم ہے۔' ان کی پیدائش غالباً ۲۲ر فروری ۱۸۷۳ء کو ایک درمیانہ درجے کے خدا ترس خاندان میں، پنجاب کے قدیم شہر سیالکوٹ میں ہوئی جو آج کل کھیلوں میں استعمال ہونے والی اشیا کے لیے، اور بلاشبہ اقبال کے حوالے سے، دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ان کے اجداد کشمیر سے آئے تھے۔ وہ اونچی ذات کے برہمن تھے اور ان کے بزرگوں نے اس وقت اسلام قبول کر لیا تھا جب وہ کشمیر ہی میں مقیم تھے۔ بدقسمتی سے ایسے ہی تلخ اور بہت سے سیاسی حالات کی بنا پر جیسے آج بھی اس بدقسمت خطے میں ہو رہے ہیں، بہت سے کشمیری خاندانوں نے اپنے وطن کو اس وقت چھوڑا تھا جب ۱۸۴۶ء میں میثاقِ امرتسر پر دستخط ہوئے تھے۔ ان میں اقبال کے دادا شیخ رفیق بھی شامل تھے جنھوں نے، تین بھائیوں سمیت، اپنے آبائی گاؤں کو ۱۸۵۷ء میں خیرباد کہا اور سیالکوٹ، پنجاب میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

''پنجاب کے قابلِ فخر بیٹوں میں سے جنھوں نے اپنے مولد کی مٹی کا نام روشن کیا اور اس کو اپنے خیالات اور اپنی تہذیب سے زرخیز کیا، ڈاکٹر سر محمد اقبال کا نام ایسا ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کے والد (شیخ نور محمد) اگرچہ خود جدید تعلیم یافتہ نہ تھے، اپنے بچوں کو تعلیم دلانے میں یقین رکھتے تھے۔ ان کے دو بیٹے عطا محمد اور محمد اقبال تھے۔ بڑا بیٹا اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد انجینئر بنا۔ چھوٹے بیٹے نے جو زیادہ ذہین تھا فنون کے شعبے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ سیالکوٹ میں مرے کالج نام کا ایک کالج تھا جو عیسائی مشن والے چلاتے تھے، محمد اقبال میٹرک کے امتحان میں کامیابی کے بعد اسی کالج میں داخل کیے گئے۔ اس زمانے میں اس کالج میں عربی اور فارسی پڑھانے کے لیے ایک عظیم عالم مولوی سید میر حسن کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ مولوی صاحب اپنے شاگردوں میں علم کے حصول اور ان میں ادب کا ذوق پیدا کرنے میں خاص دل چسپی لیتے تھے۔ ایک عظیم معلّم سے ربط نے محمد اقبال کو فارسی اور عربی میں وہ بنیاد فراہم کی جو تمام زندگی ان کے کام آئی۔''

یہ تھے وہ الفاظ جن سے سابق وزیرِ خارجہ اور لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس منظور قادر مرحوم نے اقبال کے بارے اپنے مضمون

کی ابتدا کی تھی جو شائع نہیں ہوسکا۔ یہ مضمون اقبال کی سوانح حیات کے ایڈیٹر کو فراہم کیا گیا تھا جو منظور قادر مرحوم کے والد اور عظیم شاعر کے دیرینہ دوست، شیخ عبدالقادر نے شروع کی تھی، سر کا خطاب پانے کے بعد سر عبدالقادر، وکیل، پنجاب ہائی کورٹ کے جج، وزیر تعلیم، وزیر ہند کی کونسل کے رُکن اور اخبار ''آبزور'' کے مدیر ہوئے۔

اقبال کی تعلیم مشرقی اور مغربی دونوں تہذیب میں ہوئی اور ۱۸۹۹ء میں انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کیا۔ فلسفے میں ایم اے کرنے کے بعد اقبال نے کچھ عرصے پنجاب کے دارالحکومت لاہور کے اورینٹل کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔

مرے کالج میں اپنی تعلیم کے دوران اقبال کو احساس ہوا کہ اُن میں اپنے احساسات کو اردو زبان کے شعری قالب میں پیش کرنے کا فن پیدا ہوگیا ہے۔ اور پھر انھوں نے مشاعروں میں شرکت شروع کردی۔ پنجاب کا شہر لاہور جو برطانوی حکومت کے دور میں ہندوستان کے فن اور ثقافت کے مرکزوں میں سے ایک تھا، وہاں اعلیٰ پائے کے مشاعرے منعقد ہوتے تھے جن میں شعرا اپنے شعر تحت اللفظ یا ترنّم سے پڑھتے تھے۔ لکھا ہے کہ ایسے ہی ایک موقعے پر اقبال کسی مجبوری کی وجہ سے مشاعرے میں شامل نہ ہوسکے تو ان کی جگہ مسز سروجنی نائیڈو نے، جو بذاتِ خود بہت اچھی شاعرہ تھیں، نہ صرف اپنا کلام پیش کیا بلکہ اقبال کی ایک نظم کا (انگریزی میں) ترجمہ پیش کیا جس پر بے حد داد ملی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مسز نائیڈو، جنھوں نے بعد میں ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا، اقبال کی تحریروں سے بہت متاثر تھیں اور انھوں نے اقبال کی یہ راہ اختیار کرنے پر بہت ہمت افزائی کی تھی۔

شیخ عبدالقادر بھی جن کا اوپر ذکر آ چکا ہے، جو اقبال کو ایامِ طالب علمی کے زمانے سے جانتے تھے، ادب کے افق پر اپنے دوست کا ستارہ چمکتا دیکھ رہے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے اردو زبان کی ترویج کی کوشش میں ایک رسالہ ''مخزن'' جاری کیا تھا جس میں اقبال کا ابتدائی کلام شائع ہوتا تھا۔ دراصل وہی تھے جنھوں نے ادب کی دنیا سے اقبال کا تعارف کرایا تھا اور اقبال کی اولین نظمیں ''مخزن'' میں پابندی سے شائع ہوتی تھیں۔

لاہور کالج میں تعلیم کے دوران اُن (اقبال) کے اساتذہ میں Mr T. W. Arnold تھے جو بعد میں Sir Thomas Arnold کہلائے فلسفے کے پروفیسر رہے تھے۔ اس ممتاز ماہرِ تعلیم نے جلد ہی بھانپ لیا تھا کہ اقبال نہایت ہونہار اور ذہین طالب علم تھے جن کو فلسفے کی تعلیم کا شوق تھا۔ انھوں نے اپنے شاگرد کی تعلیمی ترقی میں خصوصی دل چسپی لینا شروع کردی۔ سر ٹامس آرنلڈ اسلام اور جدید فلسفے کے بلند پایہ عالم تھے۔ انھوں نے دس برس علی گڑھ میں تدریس کی اور ۱۸۹۸ء میں، جب ان کی عمر چونتیس برس تھی، لاہور کالج سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اقبال کی دانش کی مزید نشوونما میں سر ٹامس آرنلڈ کا بڑا اثر تھا، جو اسلام اور فنونِ لطیفہ پر کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، شاعر کی حیثیت سے اقبال اپنے ابتدائی تعلیم کے زمانے ہی سے متعارف ہو چکے تھے اور ترک فارسی صوفیا میں اور اسلامی تعلیمات میں ان کی دل چسپیوں نے ان کو اس راہ سے کبھی بھٹکنے نہیں دیا۔ ایم اے میں عربی کی تعلیم کی تکمیل کے بعد اقبال نے کچھ عرصے اورینٹل کالج اور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریس کے فرائض انجام دیے جس سے وہ اکتائے رہتے تھے، اس لیے ان کا بیشتر وقت مشاعروں اور دوسری نوع کی ادبی نشستوں میں گزرا کرتا تھا۔ اوّل الذکر میں وہ اپنے غزلیں پڑھتے تھے جو بہت پسند کی جاتی تھیں جب کہ دوسری نشستوں میں وہ مختلف موضوعات پر اپنی نسبتاً طویل نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ روایتی طور پر غزلیں ہلکی رومانوی شاعری کے لیے مخصوص ہوتی تھیں مگر، دوسرے شعرا کے مقابلے میں اقبال ان کو اپنے سنجیدہ مسائل کے بیان کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ بقول مشہور تاریخ داں، پروفیسر کیرنن (Professor Kiernan) جنھوں نے ہندوستانی، ایشیائی اور یورپ کی تاریخ پر کئی کتابیں تصنیف کی تھیں اور اقبال کی کئی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے، ''اس (غزل) کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دو مصرعوں پر مشتمل ہم وزن قافیوں والے اشعار آپس میں تسبیح کے دانوں کی طرح ہم رشتہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے معنوی طور پر الگ الگ ہوسکتے ہیں اور

بظاہر الگ الگ ہونے کے باوجود آپس میں خیال کی وحدت بھی ہوسکتی ہے۔

۱۹۳۸ء میں اقبال کے انتقال کے چند دنوں بعد بی بی سی پر ایک نشریے میں سر عبدالقادر کے مطابق اقبال کو ''سننے کے لیے بہت لوگ جمع ہو جاتے تھے، سننے والے بہت دل چسپی سے سنتے بھی تھے اور ان جلسوں کے منعقد کرنے والے اداروں کی تعلیمی سرگرمیوں کے لیے مالی فائدے کا باعث بھی ہوتے تھے۔ ان کی سریلی اور پُر اثر آواز ان کے خیالات اور زبان کو چار چاند لگا دیتی تھی۔''

اپنے عظیم استاد سر ٹامس آرنلڈ کی، جو برطانیہ واپس پہنچ چکے تھے، ہمّت افزائی پر اقبال نے لاہور چھوڑا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے سمندر پار کا سفر اختیار کیا۔ یہ ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے جب ان (اقبال) کے عزیز دوست سر عبدالقادر، ایک سال قبل، انگلستان جا چکے تھے۔

عبدالقادر کے مطابق ''شاعر (اقبال) کا برطانیہ میں قیام ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک رہا۔ جہاں، بیرسٹری کی تکمیل کے علاوہ، کیمبرج جیسے تعلیم کے اعلیٰ مرکز میں تعلیم کے دوران بڑے بڑے جید دانشوروں سے ملنے اور استفادہ کرنے کے مواقع بھی ملے۔۔۔۔ جب میں ایک صحافی تھا اور اورینٹل کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ہم نے ہندوستان میں ایک دوسرے کی معاونت کی تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ اتنا وقت گزارتے تھے کہ جب میں نے ان کو بتایا کہ میں نے انگلستان جانے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے تو انھوں (اقبال) نے کہا کہ اپنے بڑے بھائی سے اخراجات کے سلسلے میں بات کرنے کے بعد وہ بھی اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلستان کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔ اس میں کچھ وقت لگا اسی لیے ان کی روانگی ایک برس بعد ہوئی۔ ان (اقبال) کے لیے پروفیسر آرنلڈ کا انگلستان میں ہونا سب سے بڑی دل چسپی کا باعث تھا، جو لاہور میں ان کے فلسفے کی تعلیم کے دوران پڑھنے کے معاملے میں ان کے رہبر بھی تھے اور دوست بھی اور انھوں نے انگلستان (اور دوسرے یورپی ممالک) میں بھی اسی ہم دردی کے جذبے میں ان (اقبال) کی رہنمائی کی۔''

یہ دراصل پروفیسر آرنلڈ ہی تھے، جو اس زمانے میں انڈیا آفس لائبریری میں لائبریرین کے عہدے پر فائز تھے، جنھوں نے اقبال کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کیمبرج میں ترقی یافتہ طالب علم کے طور پر داخلہ لے کر مقالہ لکھیں اور ڈگری حاصل کریں۔ اقبال نے ان کے مشورے پر عمل کیا۔ انھوں (اقبال) نے بیرسٹر بننے کے لیے لنکنز اِن (Linclon's Inn) میں داخلہ لے لیا۔ تین برس کی محنتِ شاقہ کے بعد ان (اقبال) کو کیمبرج سے ڈگری بھی مل گئی اور ان کو بیرسٹری کی اجازت بھی مل گئی۔ پروفیسر آرنلڈ فارسی تصوف پر ان (اقبال) کے مقالے سے اتنے خوش ہوئے کہ ان کو مشورہ دیا کہ جرمنی کی ایک یونی ورسٹی میں اسی مقالے کا جرمن زبان میں ترجمہ داخل کریں، جس پر انھوں نے عمل کیا۔ ان کی اور اقبال کی توقعات کے مطابق میونخ یونی ورسٹی نے مقالہ منظور کرلیا گیا مگر شرط عائد کی کہ اس مقالے کے مصنف کو جرمنی میں کم از کم تین برس تک قیام کرنا اور ان کو جرمن زبان میں لکھنے پڑھنے کے قابل ہونے کا ثبوت پیش کرنا ہوگا۔ لہٰذا اقبال جرمنی چلے گئے اور اس ملک کے مختصر قیام کے دوران نہ صرف جرمن زبان کے علوم سے واقفیت ہوئی بلکہ جرمنی کے رہن سہن سے متعارف ہونے کی وجہ سے ان کی وسعتِ نظر میں بھی اضافہ ہوا۔ اور پھر، بالآخر، میونخ یونی ورسٹی نے اپنے وعدے کے مطابق ان (اقبال) کو ڈاکٹر کی ڈگری (Ph.D) عطا کی۔

بلا شبہ ہندوستان کے ایک عظیم سپوت، شاعرِ مشرق کے اتنے مختصر سے خاکے میں ان کی ادبی کارگزاریوں سے انصاف نہیں کیا جاسکتا، نہ ہی میں ان کی شاعری اور ان کے فلسفیانہ خیالات کے بارے میں اپنی رائے دینے کی کوشش کرسکتا ہوں۔ میں تو صرف اس دیو ہیکل شخصیت کے بارے میں قابلِ قدر اور عظیم دانشور علما اور مبصرین کے ارشادات کے ٹکڑوں سے ایک خاکہ ہی تیار کرسکتا ہوں۔

اس منصوبے پر عمل کرنا میرے لیے اس قاری کے نکتۂ نظر سے ہے جس کا پیار ۱۹۵۹ء میں اس وقت شروع ہوا جب مجھے ایک ان جانے کا سفر درپیش تھا۔ پاکستان کے لیے، ایک نوزائیدہ ملک کے لیے جس کو اس وقت تک جرمنی میں، میونخ میں، بہت کم لوگ جانتے تھے جہاں سے اقبال نے بڑے فخریہ انداز میں اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری وصول کی تھی۔ اسی وقت میں ڈاکٹر محمد اقبال سے متعارف ہوا تھا اور پھر مجھے وہ یادگار دکھائی دی جو میونخ کے شہریوں نے جنوبی جرمنی کے شہر Schwabing کے مرکزی علاقے کے ایک باغیچے میں شاعرِ مشرق

کے اعزاز میں تعمیر کی تھی۔ اور یہ بھی میری خوش قسمتی ہی تھی کی میری ملاقات اقبال اور اُن کے کام کے ایک چاہنے والے ممتاز اور نہایت وفادار سرکاری افسر جناب ممتاز حسن سے ہوگئی۔ ان سے میری پہلی ملاقات کراچی میں ہوئی جہاں وہ نیشنل بینک آف پاکستان کے افسر اعلیٰ بھی تھے اور جرمنی کی حکومت کے بنائے ہوئے ادارے پاک جرمن فورم کے صدر بھی، جو پاکستان اور جرمنی کے درمیان دوستی کے لیے بہت کام کر رہا تھا۔ اس ادارے کے خزانچی کے فرائض مجھ سے قبل ایسٹرن فیڈرل میں متعین جرمن شخصیت سے مجھے ورثے میں ملے تھے اور اس کے ساتھ ہی میری ملاقات جناب ممتاز حسن، جناب رنگون والا، جناب عقیلی اور پروفیسر صدیقی ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ شخصیات سے ہوئی جو اس ادارے کے نہایت مخلص کارکن بھی تھے اور اس صدی کے پانچویں اور چھٹے عشرے کے کامیاب کاروباری اور دانشور بھی۔ جرمن زبان کے دیو قامت شاعر جان وولفگانگ گوئٹے (Johann Wolfgang Goethe) سے اقبال کی پسندیدگی اور ہیگل(Hegel)، نطشے (Nietzsche)اور کارل مارکس (Karl Marx) جیسے مفکرین اور مشاہیر کے اثرات ہمارے درمیان مضبوط رشتے بن گئے اور ان سب نے مل کر کے ان چند برسوں پر محیط میری ذاتی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ممتاز حسن اور ان جیسی ثقہ شخصیات ان مذہبی اور تہذیبی نظریات کی پاسبانی میں پیش پیش تھے جو سر سید احمد خان اور اقبال جیسے روحانی پیشواؤں نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی غرض سے پیش کیے تھے اور ان پر عمل درآمد بھی کیا تھا۔ اور اس بات کو میں نے اسے ہمیشہ اپنی ذاتی خوش قسمتی پر محمول کیا تھا کہ میرے پاکستان کے قیام کی ابتدا ہی سے مجھے ممتاز حسن اور ان کے ساتھیوں جیسے قد آور لوگوں کی صحبت نصیب ہوئی جس کے طفیل میں نے پاکستان کی تہذیبی اور روحانی کیفیات کی جھلکیاں بھی دیکھیں اور پاکستان کی تاریخ سے متعلق میری تربیت بھی ہوئی۔ ان حضرات کی شخصیات کی فنی ترکیب نے، مجھ جیسے نو وارد کی جھولی میں معاشیاتی اور کاروباری اطلاعات سے معمور اور ایک معتدل اور متوازن خزانہ ڈال دیا تھا جس سے مجھے اپنی آئندہ زندگی میں بہت مدد ملی۔

اس طرح مجھے پتا چلا کہ اقبال صرف ایک عالمی درجے کے معروف شاعر اور فلسفی ہی نہیں تھے۔ وہ اس تحریک کے روحانی پیشوا بھی تھے جو بعد میں تحریکِ پاکستان کہلائی۔ سمندر پار سے کامیاب واپسی کے باوجود وہ لاہور میں ایک عام قسم کے انسان رہے تھے۔ میں اب سمجھا کہ یورپ کے سفر سے پہلے اقبال ایک قوم پرست تھے۔ مگر وہاں کے قیام کے دوران ان کو جدید قوم پرستی کی مختلف صورتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس طرح ان کو تنگ نظر نسلی اور جغرافیائی وفاداری اور وسیع النظر اسلام میں فرق کا اندازہ ہوا۔ اس سے زندگی کے بارے میں ان کے نظریے میں انقلابی تبدیلیاں ہوئیں۔ اب وہ کسی ایک گروہ کے شاعر نہیں رہے، وہ پوری انسانیت کے شاعر ہو چکے تھے۔ ممتاز حسن کے الفاظ میں وہ "اُس جذباتی اور نظریاتی ارتقا کی سب سے بڑی علامت تھے جس سے برصغیر میں اسلامی تہذیب کی نشاۃ الثانیہ ہوئی اور بالآخر ایک خود مختار حیثیت میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ وہ مشرق سے اُٹھنے والے پہلے شخص تھے جس نے جدید فلسفے کے تناظر میں اسلام کا مطالعہ کیا اور بنیادی اسلامی قدروں میں اہم اور کبھی نہ ختم ہونے والے اثرات کو اُجاگر کیا۔ پاکستان میں مقیم لوگوں کے لیے وہ دنیا کی تہذیب کی جانب کھلنے والے دریچے کی مانند تھے۔ وہ بالخصوص جرمنی اور پاکستان کے درمیان ایک تہذیبی پُل کی صورت تھے۔ پاکستان اور ہندوستان میں محمد اقبال جیسا کوئی اور نہیں جو ہم کو جرمن خیالات اور جرمن تہذیب سے اتنا قریب لے گیا ہو۔" اس میں کوئی کلام نہیں کہ ۱۸۹۸ء میں سر سید احمد خان کے انتقال کے بعد اقبال ہی ہندمسلم جدیدیت کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جب وہ یورپ آئے تھے تو مغربی خیالات میں عظیم تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ فلسفے کے میدان میں وہ جدید مفکرین مشہور اور فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں (Henry Bergson) کے خیالات سے بے انتہا متاثر تھے۔ نفسیات میں سگمنڈ فرائیڈ (Sigmund Freud) نے شعوری اور لاشعوری دماغِ انسانی میں ان پوشیدہ قوتوں کو ظاہر کرنے کا دعویٰ کیا تھا اس سے پہلے جن کا استدلالی تجزیہ نہیں ہوا تھا۔ اور طبعیاتی سائنس میں البرٹ آئن اسٹائن (Albert Einstein) نے نظریۂ اضافیت (Thoery of Relativity) پیش کر کے جس کے مطابق کمیت اور اور توانائی کو

ابر تصور کیا گیا ہے، ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔

اقبال نے ان سارے نظریات اور افکار کا بغور مطالعہ کیا تھا جنھوں نے ان کے ذاتی اندازِ فکر پر گہرے اثرات مرتسم کیے۔ اقبال
نے اپنے مسلسل غور و فکر کے انعکاس کو معروضی انداز میں اپنے چھ عدد خطبات میں پیش کیا جو انھوں نے مدراس، حیدر آباد اور علی گڑھ میں دیے
تھے اور بعد میں Reconstruction of Religious Thought in Islam کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان خطبات میں
ھوں نے اپنے اس یقین کا خاکہ پیش کیا تھا کہ پہلی جنگِ عظیم کے ساتھ اسلام میں در آنے والی پانچ سو برس کے طویل عرصے کی سیاسی کم
وریوں اور روحانی اضمحلال کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اقبال کے خیال میں مغرب کی بالادستی کی اصل وجہ یہ تھی مسلمانوں کے مقابلے میں یورپی
موں نے ان سائنسی ایجادات سے استفادہ کر لیا تھا جو خود مسلمانوں ہی کی طرف سے آئیں تھیں۔ بیسویں صدی میں اسلامی دنیا میں پائے
انے والے روحانی اضطراب ہی میں اقبال اسلام کی نشاۃ الثانیہ کو دیکھ رہے تھے۔ اقبال کا تصور تھا کہ مختلف مسلم ممالک رضا کارانہ طور پر مل کر
یک وفاق ترتیب دیں اور اس سلسلے میں انھوں نے مغرب کے فلسفے کی روشنی میں اسلامی تصورات کی نئی تجسیم کی کوشش کی تھی۔ وہ قائل تھے کہ
سلامی قانون کی نئے سرے سے ترتیب ضروری ہو گئی ہے اور یہ بھی کہ قدیم راسخ العقیدہ دبستانِ قانون کو تبدیل کرنا ہوگا جس میں افراد کے
نتخاب کی گنجائش بھی ہو اور لوگ ذاتی نقطہ نظر رکھنے میں آزاد ہوں۔

یورپ سے واپسی پر انھوں نے پھر تدریس کی طرف دھیان دیا مگر صرف دو برس بعد ہی حکومت کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا
س لیے کہ وہ حکومت پر کھل کر تنقید کر رہے تھے۔ ان کا قیام لاہور ہی میں رہا، ان کی آمدنی ان کے سادہ طرزِ زندگی کے لیے کافی تھی اور ان کا
شتر وقت مطالعے اور شاعری میں گزرتا۔

اقبال کے زندگی بھر کے خدمت گزار میاں اللہ بخش نے ۱۹۵۷ء میں جناب ممتاز حسن کو ایک انٹرویو دیا تھا جس میں ان سے پوچھا
لیا تھا کہ قانونی معاملات میں کیا اقبال کو بہت وقت صرف کرنا ہوتا تھا۔ اس سوال کے جواب سے دنیاوی معاملات میں اقبال کے طرزِ عمل پر
ں چسپ روشنی پڑتی ہے۔ اللہ بخش نے کہا، ''اپنے قانونی ذریعہ معاش کے سلسلے میں وہ ایک حد سے آگے نہیں جاتے تھے۔ عام طور جب ان
و ایسا مقدمہ مل جاتا تھا جس سے ۵۰۰ روپے کی آمدنی متوقع ہوتی تو وہ مزید مقدمہ لینے سے انکار کر دیتے اور موکلوں کو اگلے ماہ آنے کا
شورہ دیتے تھے۔ اگر مذکورہ رقم کا مہینے کے شروع کے چار یا پانچ دنوں میں ہی ملنا ممکن ہو جاتا تو وہ اس مہینے میں کوئی اور مقدمہ لینے سے
نکار کر دیتے ان کے اندازے کے مطابق اپنے روز مرہ کے اخراجات کے لیے اس رقم سے زیادہ کے طلبگار نہ ہوتے۔ پرانے زمانے میں اس
م میں گھر کے کرائے، ملازموں کی اور منشی کی تنخواہ کے علاوہ گھر کے دوسرے اخراجات بھی بہ آسانی ادا ہو جایا کرتے تھے۔''

ان کے حالاتِ زندگی کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جوانی کے زمانے سے ہی اقبال دنیا کو اس نظر سے دیکھتے جو ایک
ندوستان کے متوسط مسلم طبقے کے انسان کے لیے ممکن ہوتا تھا۔ پروفیسر کیرنن کے مطابق، ''وہ اپنے آپ کو جاگیردار اور کسان کے تعلق سے
نک تھلگ رکھ کر ہندوستان کے مسلمان معاشرے کی تجدید کی رہبری کرنا چاہتے تھے۔ برطانوی استعمار کی ہندوستان پر فتح، مغل سلطنت کے
وال اور ''غدر'' کی ناکامی کے بعد پس منظر میں پھینک دیے جانے والے مسلمان نہ صرف چکرائے ہوئے تھے بلکہ اپنے معاشرے کے
وجودہ حالات سے ناخوش بھی تھے۔ اس دوران، ہندو، جو اپنی تجارتی عادتوں کی وجہ سے خود کو حالات میں آسانی سے ڈھال لینے کے عادی
تھے، آگے بڑھتے رہے۔ سر سید احمد اور علی گڑھ تحریک نے جب مسلمانوں کو نئے دور کی حقیقتوں کو گرفت میں لینے کے لیے آمادہ کیا تو قدرتی
ور پر وہ کانگریس کی ہندو قومیت تحریک کے پیچھے ہو لیے۔ لہٰذا اقبال کی ابتدائی شاعری میں ہندو اور مسلمان دونوں کو بھائیوں کی طرح شانہ بہ
انہ ایک آزاد اور متحد ہندوستان کے لیے جد و جہد کا تصور ملتا ہے، (مگر) یہ زیادہ دن نہیں چلا۔ برطانوی حکومت سے نہیں بلکہ ہندوؤں کی
لی برتری اور تنظیم کے احساس سے، باوجود مختلف تبدیلیوں کے، مسلمان درمیانہ طبقہ کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ کے دکھائے ہوئے راستے پر

چل پڑا۔

متوسط طبقے کا فرد اقبال، جاگیرداروں اور شہزادوں سے بھی قریب تھا، ان کے نیچے کے کسانوں اور مزدوروں سے بھی، اور اس طرح وہ ان سب کی نظر سے زندگی کو دیکھ سکتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اقبال، وسیع معنوں میں، ایک سیاسی شاعر تھے، جو انسان کی سماجی حالت کے بارے میں متفکر رہتے تھے۔ مگر صدی کے دوسرے عشرے سے ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو اپنے انتقال تک وہ سیاست میں بھی عملی طور پر حصہ لیتے رہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری سے استعفیٰ دینے کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حکومت کی ملازمت کی وجہ سے وہ اپنے ضمیر کے مطابق آزادی سے بول نہیں سکتے تھے۔ اور باوجود مالی حالات کی تنگی کے انھوں نے برطانوی راج کی ملازمت سے پرہیز کیا حالانکہ ان جیسے پڑھے لکھے اور قابل انسان کا اس 'نظام' میں کھپ جانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ ان کے فرزند، ڈاکٹر جاوید اقبال کے قول کے مطابق وہ کسی مسلمان ریاست میں کسی ایسے کام کی خواہش رکھتے تھے جس میں وہ اپنے ضمیر کے مطابق آزادانہ بول یا لکھ سکتے۔ وہ ریاست حیدرآباد بھی گئے جہاں ان کی ملاقات ان کے استاد محترم نواب مرزا داغ سے بھی ہوئی، جو بلاشبہ اردو ادب کے عظیم شاعر اور اپنے وقت کے شہنشاہِ غزل تھے اور نظام حیدرآباد کے 'استادِ شہ' بھی تھے۔ مگر وہ حیدرآباد کے 'مردہ' ماحول اور نظام کی انگریزوں سے چاپلوسی کے باعث نہایت دلبرداشتہ لاہور واپس ہوئے۔ ان کے پائے کے ادیب اور شاعر پر تخلیقات کے معاملے میں اپنے لوگوں کی طرف سے تہذیبی اور سماجی دباؤ کی بنا پر اس زمانے میں دوستوں کو لکھے ہوئے خطوط میں اقبال ایک تلخ نوا اور مایوس انسان دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے خطوط ان لوگوں کی کلبیت، منافقت، تنگ نظری اور خودغرضی کے حوالوں سے پُر ہیں جن کے درمیان وہ پیدا ہوئے تھے۔

یورپ میں تین برس کی مشقت آمیز تعلیم ہی ان کے سیاسی شاعر بننے کا سبب تھی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، انھوں نے 'وحدت الوجود' کے معتقد فارسی کے عظیم شاعر حافظ کے زیرِ اثر اپنا ادبی مشغلہ 'ہمہ اوست' کے عقیدے کی بنیاد پر شروع کیا تھا۔ اقبال کے فرزند جاوید لکھتے ہیں، ''انھوں نے رومانوی شاعر کی حیثیت سے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا اور ساتھ ساتھ اپنے سیاسی خیالات کی بنیاد عقیدۂ وحدت الوجود پر رکھی۔ لہٰذا انھوں نے ہندوستان کی قومیت کی پاسداری میں نظمیں لکھیں۔ مگر یہ ایک دورِ گزراں تھا۔ یورپ میں تین برس کے قیام نے ان کے ذہن مین ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ وہ وحدت الوجود کے فلسفے کو غیر تسلی بخش قرار دے کر اسلامی یک جہتی کی طرف مائل ہو گئے۔''

''یہ مسلم قومیت کا ارتقا ہی تھا جس نے ہندوستانی قومیت کی تحریک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور بالآخر اسلام کی ہندوستان سے علیحدگی پر منتج ہوئی۔'' اقبال کے ذہن کی تبدیلی ان کے ۱۹۰۹ء میں لکھے ہوئے خطوط میں سے ایک میں واضح طور پر جھلکتی ہے۔ ''میں خود بھی اس خیال کا حامی ہوں کہ اس ملک (ہندوستان) سے مذہبی تفرقہ ختم ہونا چاہیے اور میں تو اپنی نجی زندگی میں بھی اسی پر عمل پیرا ہوں۔ مگر میرے خیال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی قوموں کی حیثیت سے الگ الگ پہچان کو برقرار رہنا چاہیے۔ ہندوستان کے لیے ایک مشترک قومیت ایک سہانا تصور ہے اور اس میں شاعرانہ حسن بھی ہے مگر موجودہ حالات کے اور دونوں قوموں کے لاشعوری رجحانات کے پیشِ نظر قابلِ حصول نظر نہیں آتا۔'' تو یہ تھا وہ آزاد، خودمختار اسلامی مملکت کا نقیب جس نے کئی عشروں بعد، آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے صدر کی حیثیت سے، جو ۲۹/دسمبر ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں منعقد ہوا تھا، اپنے مشہور خطبے میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا تھا جو مسلمانوں کے لیے ایک مترنم صدا تھی۔

''فرقہ وارانہ گروہوں کی شناخت کے فیصلے کے بغیر یورپ کی جمہوریت کے اصول ہندوستان میں لاگو نہیں ہوتے۔'' اقبال نے فرمایا، ''لہٰذا مسلمانوں کا 'ایک مسلم ہندوستان' کا مطالبہ بالکل برحق ہے۔''

انھوں نے تحیر میں ڈوبے ہوئے شرکاء سے کہا، ''ذاتی طور پر میں پنجاب، شمالی صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک اور خودمختا

ملکت کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں، خواہ وہ برطانوی راج میں ہو یا اس سے باہر۔ اور کم از کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ثال مغربی ہندوستان میں ایک مسلم مملکت کا قیام میرے نزدیک حتمی طور پر مقسوم ہے۔''

اس کو اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۰ء کے نومبر دسمبر سے کچھ عرصہ قبل پہلی گول میز کانفرنس کے دوران چودھری رحمت علی نامی ایک ساحب لندن میں مقیم مسلمان زعما سے ملے تھے اور انھوں نے پہلی بار ہندوستان کی تقسیم کی تجویز پیش کی تھی جس میں پاکستان کا نام پیش کیا گیا نا۔ P سے مراد پنجاب، A سے مراد افغانیہ (یعنی شمال۔ مغربی سرحدی صوبہ)، K سے مراد کشمیر، I سے مراد ایران، S سے مراد سندھ اور tan ے مراد تھا بلوچستان۔ وہ اقبال جیسے ایک نوجوان پنجابی طالب علم تھے جو اپنے دوستوں کے ہمراہ سیاسی حلقوں میں، جو ساتھی طالب علموں پر شتمل ہوتے تھے، اس نوعیت کی ایک 'تجویز' پر بحثیں کیا کرتے تھے۔ یہ لفظ (پاکستان) پہلی بار جنوری ۱۹۳۳ء میں شائع ہونے والے ایک ہار ورقی کتابچے میں نظر آیا جس کا عنوان تھا Now or Never جس پر چودھری رحمت علی اور ان کے تین دوستوں کے دستخط تھے۔

اقبال نے جب آل انڈیا مسلم لیگ کے مندوبین پر اپنے منصوبے کو افشا کیا تو وہ سب حیران رہ گئے ہوں گے اس لیے کہ، جیسا کہ چودھری خلیق الزماں نے اپنی سوانح حیات میں رقم کیا ہے، ''تعجب کی بات ہے کہ نہ مسلم لیگ کی کاؤنسل نے صدر کے خطبے پر کسی قسم کا ردِ سل ظاہر کیا نہ ہی ان کے منصوبے کے بارے میں کوئی ٹھوس تجویز پیش کی۔'' جیسا کہ شریف الدین پیرزادہ نے بعد میں اپنی روداد میں لکھا تھا کہ اقبال کے خطبے کے بعد گرما گرم بحث کے دوران مندوبین کی رائے میں شدید اختلافات ظاہر ہوئے۔ 'اختلافات اس حد تک بڑھ گئے کہ قبال اجلاس چھوڑ کر چلے گئے۔' اس کے باوجود اس میں کوئی کلام نہیں ان کا خطبہ مسلم لیگ کی جد و جہدِ آزادی میں ایک تاریخی سنگِ میل کی یثیت اختیار کر گیا۔

اقبال ۱۹۲۶ء میں باقاعدہ سیاست میں اس وقت داخل ہوئے جب ان کے دوستوں اور مداحوں نے ان کو پنجاب کی قانون ساز ونسل کی رکنیت کے لیے انتخاب لڑنے پر تقریباً مجبور کر دیا تھا۔ انھوں نے لاہور کی مسلمان آبادی سے انتخاب میں بے مثال کامیابی حاصل کی ر پارٹی کی باقاعدہ رکنیت کے بغیر وہ مقامی سیاسی جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور انھوں نے کونسل کی رکنیت کی پوری مدت مکمل کی۔ ملکی ر بین الاقوامی سطح پر ان کی شہرت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ آغا خان اور محمد علی جناح کے ہمراہ، مسلم مندوب کی حیثیت سے ۱۹۳۱ء میں ھوں نے لندن میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ مندوب کی حیثیت سے انھوں نے مسلمانوں کے حقوق کی وکالت اور ہندوستان کی طرف سے آئینی ترتیبِ نو کے مطالبے، دونوں معاملات میں ایک اہم کردار ادا کیا۔''

آزادی کی جنگ لڑنے والے عظیم لوگوں کی زندگی کے موضوع پر جناب جی الانا کی معرکتہ الآرا کتاب کے مطابق، ''۱۹۳۲ء میں لامہ اقبال ایک بار پھر مندوب کی حیثیت سے تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن آئے۔ اس وقت قائدِ اعظم انگلستان ہی میں تھے اور انھوں نے ہندوستان کی باقاعدہ سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ یہ دونوں حضرات اکثر ملتے تھے اور کانفرنس میں پیش آنے لے واقعات اور بحثوں کی بظاہر ناکامی سے دلبرداشتہ تھے۔''

''ہندوستان واپسی پر علامہ اقبال نے ۱۹۳۲ء میں منعقد ہونے والی آل انڈیا مسلم لیگ کی کانفرنس کی صدارت کی اور اپنے خطبۂ سدارت میں انھوں نے فرمایا کہ وہ اس نوعیت کی قومیت کے خلاف ہیں جیسی کہ یورپ والے سمجھ رہے ہیں، اس لیے کہ اس میں لامذہب دہ پرستی کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ جو چیزیں حقیقتاً اہم ہوتی ہیں وہ انسان کا عقیدہ، اس کی تہذیب اور اس کی تاریخی روایات ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ ''میری نظر میں یہی وہ باتیں ہیں جن کے لیے جیا اور مرا بھی جا سکتا ہے، نہ کہ کسی خطۂ زمین کے لیے جس سے انسان کا جذباتی او عارضی ہوا کرتا ہے۔''

اقبال نے اپنی وفات تک سیاست میں حصہ لیا۔ کچھ عرصے کے لیے وہ پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے صدر رہے اور قائدِ اعظم کی

ہندوستان واپسی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مسلمہ رہبر بننے تک دونوں ایک دوسرے سے قریبی رابطے میں رہے۔ اقبال خطوط کے ذریعے جناح صاحب کو پنجاب کے حالات سے اور کُل ہندنوعیت کے مسائل پر اپنے ذاتی خیالات سے آگاہ کرتے رہے۔ الانا صاحب کے مطابق، ''ان خطوط سے پتا چلتا ہے کہ یہ دونوں رہبر کس طرح ایک دوسرے کے شانہ بشانہ رہے اور یہ بھی کہ ان دونوں میں برصغیر کے مسلمانوں کے حتمی ہدف اور ان کے مقدّر کے بارے میں کس قدر ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔''

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے شخصی خاکے میں اس نوعیت کے بہت سارے 'ٹکڑے' شامل کیے جاسکتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ سب اس شخص کی تصویر میں نہ صرف رنگ بھریں گے بلکہ قاری کے ذہن کے لیے بہت کچھ مہیا کریں گے۔ وہ سب ٹکڑے دراصل ایک ایسے حیرت افزا سفر کی جزئیات ہوں گے جس کا بیان دل چسپی کا حامل ہوگا۔ ان سے ایک انسان کی ایسی تصویر بنے گی جو بلاشبہ ہر شے پر حاوی رہا اور جو بین الاقوامی سطح پر 'شاعرِ مشرق' معروف ہوا، اس کو ۱۹۲۲ء میں انگلستان کے بادشاہ کی جانب سے 'سر' کا خطاب عطا ہوا اور وہ برّصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا مسلمہ اور ہردلعزیز رہبر بنا۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ باوجود اتنی محبت اور اتنے سارے اعزازات کے اپنی زندگی کے اختتام تک اقبال نے نہایت سادہ زندگی گزاری۔ ان کی زندگی کے آخری ایام ایسے غم کے سائے میں بسر ہوئے جوان کی رفیقِ حیات کی موت نے ان کے سر پر تان دیا تھا، اور اس پر مستزاد ایک طویل عرصے تک ان کی صحت خراب رہی۔ ان کے زندگی بھر کے خادم کے مطابق وہ ایک ایسے نرم دل انسان تھے جو اپنے ہر عمل میں بہت مضبوط کردار رکھتے تھے اور شاید ہی کبھی غصے میں آتے تھے۔ وہ اپنے دونوں بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی بیٹی اور بیٹے دونوں نے اہلیہ کی وفات کے بعد ان کا بہت خیال رکھا۔

ان کی نظریاتی صلابت اور قوتِ ارادی آخر دم تک ناقابلِ شکست رہی بلکہ اپنے لوگوں کی خدمت کے سلسلے میں ان کے ارادے روز بروز مستحکم ہوتے رہے حالانکہ ان کی جسمانی قوت تیزی سے زوال پذیر تھی۔ ان کی نظر اچانک اتنی کم زور ہوگئی تھی کہ خطوط لکھنے کے لیے انھیں اپنے دوستوں سے مدد لینی پڑتی تھی۔

۲۰ر اپریل ۱۹۳۸ء کو ان کا آخری ملاقاتی اتفاق سے ایک جرمن شخص، ایک مشہور مسافر، مستشرق اور فلسفی Hans-Hasso von Veltheim Ostrau تھا۔ اپنی یادداشت میں جو دوسری جنگِ عظیم کے بعد شائع ہوئی اس نے لکھا:

''دوپہر کے وقت میں مشہور شاعر اور فلسفی سر محمد اقبال سے ملاقات کو گیا۔ وہ کئی ماہ کی علالت کے سبب صاحبِ فراش تھے۔ انھیں دمے کا اور سینے کے درد کا عارضہ لاحق تھا، موتیابند کی وجہ سے وہ تقریباً نابینا سے ہو چکے تھے۔ ہم نے گھنٹوں فلسفے اور مصوری پر تبادلہ خیال کیا اور عالمی سیاسی حالات پر باتیں کیں۔ جرمنی میں قیام اور سفر کی وجہ سے اقبال جرمنی کو پسند کرتے تھے اور جرمن شاعر گوئٹے سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے کچھ عرصہ قبل مجھ سے اتفاق کیا تھا کہ وقت کی ضرورت کے پیشِ نظر اب ہندوستانیوں اور جرمنوں کے درمیان قریبی روحانی رشتے استوار ہونے چاہییں۔ میں نے اپنے لاہور کے دوستوں سے کہا تھا کہ میرے نزدیک اب اقبال کا وقتِ آخر دور نہیں، تاہم مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں اقبال سے ملنے والا آخری آدمی ہوں گا۔ دوسرے دن صبح ہندوستان کے اخبارات کے ضمیمے شائع ہوئے جن میں ۲۱ر اپریل علی الصباح اقبال کے انتقال کی خبر تھی، یعنی ان سے میری ملاقات کے چند گھنٹوں بعد اقبال کا انتقال ہوگیا۔ ہندوستان بھر کے اسکول، یونی ورسٹیاں، عدالتیں اور بازار سب اقبال کے انتقال کے سوگ میں بند ہو گئے اور ہندوستان کے مسلمانوں نے اقبال کے موت پر کئی دن سوگ منایا۔ اخباروں نے لکھا، ''بدھ کی رات سر محمد اقبال ہشاش بشاش تھے اور انھوں نے کافی دیر تک اپنے جرمن دوست Baron von Veltheim سے باتیں کیں۔ دونوں نے کافی دیر تک فلسفے اور سیاست پر تبادلہ خیال کیا۔ جرمن دوست کی روانگی کے بعد اقبال دو بجے رات تک سوئے رہے اور صبح کے قریب سینے میں اٹھنے والے درد نے ان کو بیدار کردیا۔ اقبال کو اندازہ ہوگیا تھا کہ موت قریب ہے ،انھوں نے فارسی کے کچھ تازہ اشعار لکھوائے۔ ان کے آخری الفاظ تھے: میں مسلمان ہوں، موت سے نہیں ڈرتا۔ میں اس کو مسکراتے ہوئے

خوش آمدید کہوں گا۔'' ایک بڑا مسلمان، شاعر، فلسفی اور مسلمانوں کے حقوق کا علمبردار رخصت ہوگیا۔ سر عبدالقادر کے قول کے مطابق اس کا جنازہ ایسی دھوم سے اُٹھا تھا شاید کہ شہزادے اس کی تمنا کرتے۔ ان کی آخری آرام گاہ لاہور میں بادشاہی مسجد کے قریب واقع ہے جہاں روزانہ لوگ فاتحہ خوانی کے لیے آتے ہیں اور اپنے جذبات کے تشکر کی علامت کے طور پر قبر کی پائنتی پھول چڑھاتے ہیں۔

''افکارِ پریشاں'' کے عنوان کی ایک نوٹ بک میں جو ۱۹۲۱ء میں تحریر کی گئی تھی، اقبال نے ایک جگہ لکھا تھا، '' قومیں افراد کے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں، سیاست دانوں کے ہاتھوں پھلتی پھولتی اور مر جاتی ہیں۔''

کم از کم، محمد اقبال کے تصورِ اسلامی مملکت پاکستان کے معمار اپنے عہد کے قابلِ فخر رہنما قائداعظم محمد علی جناح تھے جو اس قول کے تخلیقی اور نشو ونمائی پہلوؤں کے مصداق نظر آتے ہیں۔ قائد کی قبل از موت نے مسائل کے بہت سے دروازے وا کر دیے ہیں، بدقسمتی سے جو آج بھی کھلے ہوئے ہیں۔

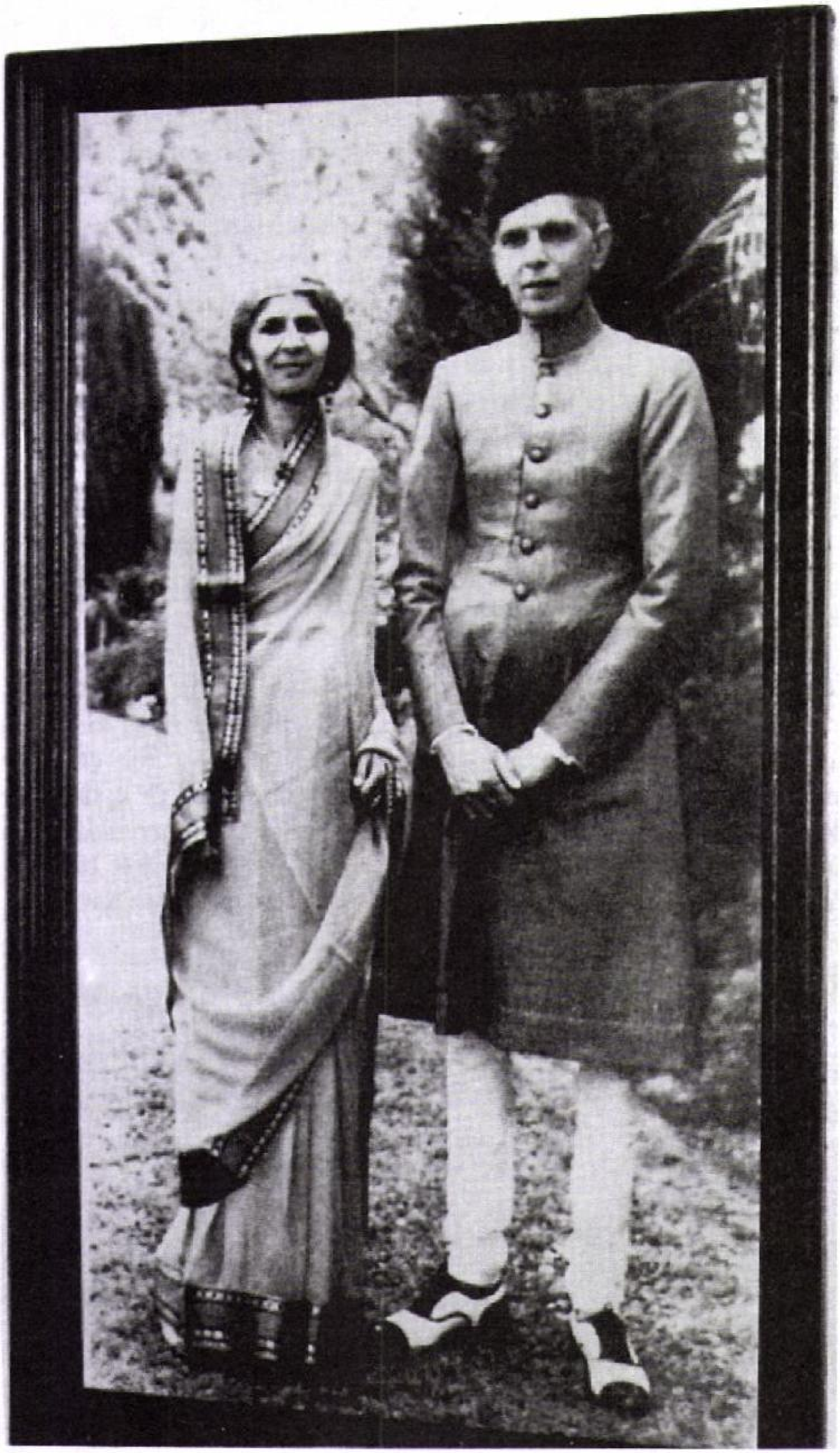

قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح بمبئی مالابار ہل پر (اندازاً ۱۹۴۳ء)

مسٹر محمد علی جناح ایک کامیاب بیرسٹر (اندازاً ۱۹۱۲ء)

جناح صاحب کی جائے پیدائش

جناح صاحب بحیثیت گورنر جنرل آف پاکستان محترمہ فاطمہ جناح، وزیرِ اعظم لیاقت علی خان
اور ان کی اہلیہ کے ہمراہ

قائداعظم محمد علی جناح، روشن علی بھیم جی صاحب سے محوِ گفتگو (بمبئی اندازاً ۱۹۴۴ء)

# قائدِاعظم محمد علی جناح

## بانئِ پاکستان

پاکستان کی تخلیق نے ادب کا ایک بڑا اور متنوع ذخیرہ پیدا کیا ہے جس کی تخلیق مشہور صاحبانِ علم، ادیبوں اور تاریخ نگاروں کے ہاتھوں ہوئی ہے جو اس 'عظیم تقسیم' کے دونوں جانب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر کچھ بے حد اہم اور قابلِ تعظیم تخلیقات ایسی بھی ہیں جو برِصغیر سے باہر، یعنی انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکا سے آئی ہیں۔

ایسی بے شمار شخصیتوں کی سوانح حیات تحریر کی گئی ہیں جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے سفر میں قابلِ تعریف کردار ادا کیے تھے۔ ان میں سے کچھ، بشمول مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو، ایسے لوگ تھے جنھوں نے اپنی سوانح حیات خود تحریر کیں اور کئی اور کتابیں تصنیف کیں جو ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے قریبی تعلق رکھتی ہیں۔

پاکستان کے بانی محمد علی جناح نے، جن کو غیر منقسم ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کا ایک غیر متنازعہ رہنما ہونا تھا، بلاشبہ گاندھی اور نہرو کے برابر آزادی کی تحریک میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ انھوں نے نہ اپنی کوئی سوانح حیات لکھی، نہ کسی قسم کی کوئی 'سیاسی دستاویز' چھوڑی۔ امکان اس بات کا ہے کہ عمر کے آخری برسوں میں تیزی سے گرتی ہوئی صحت اور کام کے بے حد دباؤ کے باعث ان کو وقت ہی نہیں ملا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اپنے پورے عرصۂ حیات میں ان کو خوب صورت نثر لکھنے کا کوئی شوق نہیں رہا۔ مگر ان کی سوانح حیات لکھنے والوں میں سے تاریخ کے مشہور پروفیسر اسٹینلے والپرٹ (Stanley Wolpert) کہتے ہیں: ''کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تاریخ کے دھارے کو بدلتے ہیں۔ ان میں سے اور بھی کم لوگ دنیا کی جغرافیہ تبدیل کرتے ہیں۔ مشکل سے کوئی ایک آدھ ہی ایسا ہو جس کو ایک قوم کو تشکیل دینے کا اعزاز دیا جا سکے۔ محمد علی جناح نے یہ تینوں کارنامے سرانجام دیے۔''

لہٰذا پاکستان کی تخلیق ان کا چھوڑا ہوا ورثہ تھا جو مسرت کا، ستائش کا، محبت کا اور شدید نفرت کا باعث تھا۔ کس کے جذبات کس نوعیت کے تھے اس کا انحصار اس بات پر تھا کہ کس کا وطن اس ''عظیم تقسیم'' کی کس جانب تھا۔

جناح صاحب کی بہت سے سوانح حیات لکھی جا چکی ہیں، زیادہ تر واقعی پڑھنے کے قابل ہیں، اور سب اس شخص کی تعریفوں سے لبریز ہیں جس کا پاکستان میں 'بابائے پاکستان' کے نام سے احترام کیا جاتا ہے، جس کی بے مثال صلاحیتوں کا لوہا اس کے دوست اور دشمن دونوں ہی مانتے تھے۔

آغا خان، جو ہندوستان کی سیاست میں جناح صاحب کے ہمراہ شریک رہے تھے اور جو ہر بات میں ان سے اتفاق بھی نہیں کرتے تھے، اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں:

'' قائدِاعظم کا شان دار اور تاریخ ساز کردار، جو نا وقت ختم ہو گیا، ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں اپنے عروج پر تھا۔ اب وہ تاریخ کا حصہ

بن چکے ہیں ان کی یادیں لازوال ہیں۔ ان تمام مشاہیر میں سے میں جن سے واقف رہا ہوں فرانسیسی وزیرِاعظم Clemenceau، لائڈ جارج، چرچل، کرزن، مسولینی، مہاتما گاندھی ان میں جناح سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہیں اور ان کے کردار میں ایک ناقابلِ مثال امتزاج تھا ماقبل سائنس علوم اور اس ہمت آمیز جذبے کا جس کو ریاستی انتظام کار کہتے ہیں۔

میں غیرضروری تفصیلات بیان کر کے ''الٹے بانس بریلی'' لے جانے کی کوشش نہیں کروں گا اس لیے کہ ایسا کرنا قائد کے سوانح سے متعلق خالی صفحات کو بلا وجہ بھرنے کے مترادف ہوگا۔ جب میں نے اور میرے دوست روشن علی بھیم جی نے اس کتاب کے خاکے اور اس کے مواد پر تبادلۂ خیالات کیا تھا تو ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس کتاب میں ہندوستانی مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں سفر اور بالآخر آزادی حاصل کرنے کا تاریخی تجزیہ ہونا چاہیے نہ کہ یہ ڈیڑھ سو برس پر محیط ایک تاریخی نصاب ہو یا برصغیر کی آزادی کی تاریخ اور اس میں حصہ لینے والے تمام سربرآوردہ اور مشہور کرداروں کی سوانحِ حیات بن کر رہ جائے۔ بلا شبہ ہمیں اس بات کا اعتراف تھا کہ ہم، بعض وجوہ کی بنا پر، ایسا کرنے کے اہل نہیں، نہ ہی اس سے ہمارا اصل مقصد پورا ہوتا، نہ ہمارے ارادوں کی تکمیل ہوتی۔ جیسا کہ میں نے بار بار کہا ہے، اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس میں ہمارے ادارے کے اہم کارکنوں اور ان کے اہلِ خانہ کے حالات درج ہوں۔ اس کے علاوہ یہ مقصد بھی تھا کہ اس کے ذریعے ہم اپنے گاہکوں، ان کے اہلِ خاندان اور ان کے دوستوں کی شکرگزاری کا حق بھی ادا کر سکیں۔ جیسے جیسے اس کے خدوخال ابھرتے گئے، ہمیں یقین ہوتا گیا کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے اور ساتھ ہی یہ سوال بھی ابھرنے لگا کہ کیا ہم اس کے قارئین کی دل چسپی کے لیے اس کے مواد میں اضافہ کریں۔ مثال کے طور پر، صحافی حضرات اور اس کاروبار میں شریک ملک کے دوسرے اداروں کے اہلکار اور افسران، تاریخ اور معاشیات کے طلبہ اور عام طور پر اس موضوع دل چسپی رکھنے والے عملی سیاست دانوں اور مخیّر حضرات کے لیے بھی اس کتاب میں دل چسپی کے لیے کچھ ہو۔ ہمار ہرگز ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا کہ ہم ان صاحبانِ علم سے مقابلے کی کوشش کرتے نظر آئیں جنھوں نے اس موضوع پر نہایت عمدہ تصنیفات پیش کی ہیں۔ اس کے برعکس، جیسا کہ ہمارے قارئین نے دیکھا ہوگا، میں نے ایسے اہم اہلِ علم سے استفادہ کیا ہے اور میں صمیمِ قلب سے ان کا شکرگزار بھی ہوں۔ یہ سب صرف اس تاریخی تناظر ہی کے لیے نہیں جو میں اس باب میں پیش کر رہا ہوں بلکہ ان تمام خاکوں اور شخصی تفصیلات کے بارے میں ہے جو ان لوگوں کے ضمن میں پیش کیے گئے ہیں جنھوں نے اس ادارے EFU Group of Companies کی بنیادگزاری اور اس کے ارتقا میں حصہ لیا ہے۔ ان میں سے کئی ایسے بھی ہیں جنھیں پاکستان کی تاریخ میں مقام حاصل ہے اور جو اس کی تحریر میں عملی طور پر معاون رہے ہیں۔ یہ اشارے بالخصوص قائدِاعظم کی طرف ہیں جن کی کارگزاریوں کے ذکر سے کتابیں ہی نہیں کتب خانے بھرے جا سکتے ہیں، اور جن کی زندگی کی تفصیلات سے اس ملک کے نہ صرف تمام اہم لوگ بلکہ اسکول کے ابتدائی درجوں کے طلبہ بھی واقف ہیں۔

پھر بھی، ہمارا خیال یہ تھا کہ ہمارے لیے اس اہم شخصیت کی کارگزاریوں اور اس کے حالاتِ زندگی کو یاد کر لینا ہی کافی نہ ہوگا جو، وولپرٹ (Wolpert) کے بقول ان کمیاب شخصیتوں میں سے تھا جو دنیا کا نقشہ بدل دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اور اس کی زندگی کے بارے میں بہت سی عمدہ لکھی ہوئی دل چسپ کتابوں کے مطالعے کے بعد اچانک مجھ پر دو نکتے عیاں ہوئے۔

سب سے پہلے تو میں حیران ہوا کہ اس قائد اور عظیم رہنما پر لکھے جانے والے ہزاروں لاکھوں صفحات کے باوجود ہم جیسے قاری اور تاریخ کے طالب علم کو محمد علی جناح نام کے ایک انسان، ایک جوان ہوتے ہوئے لڑکے، اور اس کے اہلِ خانہ، اس کے دوستوں اور مدرسے کے ساتھیوں کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ نہ ہی ہم کو ان کے ذہنی جھکاؤ، ان کی تفریحات اور مہم جوئی کی تفصیلات ملتی ہیں نہ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات کی۔ ان کی اصل سوانح حیات جو عام لوگوں کو مہیا ہے، اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب ان کی عمر سترہ سال تھی اور وہ انگلستان کی مشہورِ زمانہ Lincoln's Inn میں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے سمندری سفر پر روانہ ہو رہے تھے، اور وہ ہندوستان کے

سب سے کم عمر طالب علم تھے جن کو بیرسٹری کی تعلیم کے لیے داخلہ دیا گیا تھا۔

بے شک، جناح صاحب کے خاندانی حالات اور پیدائش کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں۔ میں جناب جی الانا کی لکھی ہوئی کتاب سے بہت متاثر ہوا ہوں۔

سرکاری ملازمت کی بہترین اور قابلِ ذکر روایات کے علاوہ الانا صاحب ایک مصنف اور بین الاقوامی شہرت کے حامل شاعر تھے۔ تاریخ، ادب اور شاعری میں ان کا ایک اعلیٰ کارکردگی کے باعث منفرد مقام ہے۔ ان کی نظمیں بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں جب کہ تاریخی تناظر میں ان کی کتابیں معیار کا درجہ رکھتی ہیں۔

آیئے دیکھیں کہ وہ (جناب الانا) قائد کی سوانحِ حیات میں اس بارے میں کیا کہتے ہیں:

''ایک طرف تو ہندوستان بھر میں ۱۸۵۷ء کے ''غدر'' کی بھیانک تباہ کاریاں اپنے عروج پر تھیں، دوسری طرف کاٹھیاواڑ کے علاقے کی ایک چھوٹی سی ریاست ''گوندل'' میں بغیر کسی سیاست آمیزی کے ریاست کے حاکم ٹھاکر صاحب کی سربراہی میں زندگی اپنی معمول کی رفتار سے چل رہی تھی۔ ریاست کا دارالحکومت گوندل اگر چہ ریاست کا سب سے بڑا شہر تھا مگر اس کی زیادہ تر آبادی دیہاتوں میں رہتی تھی۔ ان دیہاتوں میں ''پنیلی'' نام کا ایک گاؤں تھا جس کی آبادی، غدر کی پہلی لہر کے وقت، ایک ہزار سے بھی کم تھی۔ اس خاموش گاؤں میں ایک محنتی بوڑھا انسان، ایک اسماعیلی خوجہ، جس کا نام پونجا بھائی تھا، رہتا تھا۔ اس کے آبا واجداد سب اسی گاؤں میں رہے، کام کیا اور مرگئے۔ پنیلی کے رہنے والوں کا ذریعہِ معاش کاشت کاری ہی تھا مگر پونجا بھائی اُن لوگوں سے اس طرح مختلف تھے کہ انھوں نے ہاتھ سے چلنے والی کچھ کھڈی کی مشینیں لگا رکھی تھیں جن پر وہ سارا دن کپڑے بُنا کرتے تھے۔ اس کاروبار سے وہ اتنی رقم کما لیتے تھے کہ وہ اور ان کے اہلِ خانہ قناعت اور سکون سے زندگی گزار رہے تھے۔

پونجا بھائی کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا جناح بھائی جو ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا، اپنے دو بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور چوکس انسان تھا۔ اس کے نوجوان اور آگے بڑھنے والے ذہن کے لیے پنیلی ایک چھوٹی سی جگہ تھی جہاں اس کے سامنے آگے بڑھنے کے سارے راستے مسدود تھے سوائے چند کھڈیوں کی مشینوں کے جن کے ذریعے عسرت بھری زندگی ہی ممکن تھی۔ اس کو بہت جلد اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ اس گاؤں میں وہ زندگی نصیب نہیں ہوگی جس کی تمنا اس کے دل میں ہے۔ بڑا شہر گوندل نوجوان کی امنگوں کو پورا کرسکتا تھا اس لیے جناح بھائی خاموشی سے پنیلی چھوڑ کر گوندل چلا گیا۔''

الانا ہمیں بتاتے ہیں کہ کس طرح نوجوان جناح بھائی ایک کامیاب تاجر بنا اور یہ بھی کہ گاؤں واپسی پر 'دھرافہ' نامی گاؤں کے ایک باعزت خوجہ خاندان کی مٹھی بائی نامی ایک لڑکی سے شادی کرلی۔ شادی شدہ جوڑا گاؤں سے نقل مکانی کر کے گوندل چلا گیا جہاں جناح بھائی کا کاروبار اس کی توقعات سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ جلد ہی یہ 'بڑا شہر' بھی اس نوجوان کے لیے چھوٹا پڑ گیا اور جناح بھائی نے یا تو چکا چوند پیدا کردینے والے کاروباری شہر بمبئی یا کراچی منتقل ہونے کی ٹھانی۔ اس زمانے میں کراچی کی آبادی پندرہ ہزار نفوس پر مشتمل تھی مگر نوجوان کے کاروبار کے نقطۂ نظر سے وہاں امکانات بہت تھے۔ جناح بھائی نے کراچی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا اور کھارادر کے علاقے میں نیونہام روڈ پر واقع ایک عمارت میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا اور قریب ہی ایک جگہ اپنا دفتر قائم کرلیا۔

یہاں بھی جناح بھائی کا کاروبار چمکا اور ان کا شمار کراچی کے سربرآوردہ تاجروں میں ہونے لگا جس کے تجارتی روابط سمندر پار کے ملکوں سے ہوگئے تھے۔ جناح بھائی جن اشیا کی تجارت کرتے تھے ان میں دو اشیا isinglass مچھلیوں سے حاصل ہونے والی gelatin اور Acacia gum-arabic درختوں سے حاصل ہونے والی گوند تھیں۔

اتوار کا دن تھا اور ۲۵ ردسمبر کی تاریخ جب ۱۸۷۶ء میں کھارادر کی ایک دائی کی مدد سے مٹھی بائی نے اپنے پہلے بیٹے کو جنم دیا جس کا

نام محمد علی رکھا گیا۔ محمد علی کے علاوہ مٹھی بائی نے چار بیٹیاں اور دو بیٹے جنم دیے۔ محمد علی سب میں لاڈلا تھا۔ اس کی ایک بہن جس کا نام فاطمہ تھا بعد کو محمد علی کی سیاسی جدو جہد میں اس کی دستِ راست بنی۔

اس زمانے کے دستور کے مطابق محمد علی جناح کی (جن کو اب ہم صرف جناح کہیں گے) تاریخِ پیدائش کے بارے میں حتمی اطلاع نہیں۔ اگر چہ محمد علی کے پہلے اسکول کے مطابق اس سے پہلے کی کچھ اور تاریخ ملتی ہے تاہم جناح کے اصرار پر وہی تاریخ اصل مانی گئی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ لہٰذا وہ صرف سات دن کا تھا جب انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ قیصرِ ہند بنیں اور اسی برس ان کی تاج پوشی ہوئی اور جب سلطنتِ برطانیہ وجود میں آئی تو ہندوستان تاجِ برطانیہ کے کا سب سے چمک دار ہیرا بن گیا۔ جناح کے پہلے سوانح نگار ہکٹر بولیتھو (Hector Bolitho) لکھتے ہیں" اور اسی بچے نے ملکہ برطانیہ کے پڑپوتے سے ہندوستان کی تقسیم اور برطانوی تسلط سے آزادی کے معاملے پر لین دین کیا"

جناح کا بچپن کراچی میں گزرا اور چھ برس کی عمر سے شروع ہونے والی ان کی ابتدائی تعلیم بھی یہیں ہوئی۔ دس برس کا سن تھا جب جناح بمبئی بھیج دیے گئے جہاں وہ اپنے ایک قریبی رشتے دار کے ہاں مقیم ہوئے، مگر صرف ایک برس بعد وہ اپنی جائے پیدائش کراچی واپس آگئے۔ معلوم نہیں کراچی کو واپسی بیمار والدہ کی خواہش پر ہوئی تھی یا جناح کی خاندان سے دوری اس کا سبب بنی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا داخلہ سندھ مدرسۃ الاسلام میں ہو گیا تھا۔ یہ مدرسہ اب بھی قائم ہے اور اس کے پھاٹک پر "Enter to Learn -- and Go Forth to Serve" کی عبارت آج بھی لکھی ہوئی ہے اور شاید کم سن جناح نے اس عبارت کو اپنی گرہ میں باندھ لیا تھا اس لیے کہ دیکھا جائے تو ان کی پوری زندگی اسی عبارت سے عبارت ہے۔

پندرہ برس کی عمر میں جناح کرسچین مشنری سوسائٹی ہائی اسکول میں داخل کردیے گئے اور ایک برس بعد جب وہ وہیں طالب علم ہی تھے، جیسا کہ اس دور کا رواج تھا، بارہ برس کی ایک کاٹھیا واری خوجہ لڑکی سے ان کی شادی کردی گئی۔ تھوڑے دنوں بعد ہی وہ قانون پڑھنے انگلستان چلے گئے۔ اسی دوران نہ صرف ان کی نوجوان بیوی کا انتقال ہو گیا بلکہ ان کی ماں بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں اور ایسا لگتا ہے کہ ان سانحوں اور مالی مشکلات کی وجہ سے ان کے والد پریشانیوں کا شکار ہوگئے۔

جیسا کہ میں کہیں لکھ چکا ہوں، چوں کہ وہ روز نامچہ لکھنے کے عادی نہیں تھے، جناح نے خود اپنے بچپن اور نوجوانی کے ایام کی تفصیلات کبھی بیان نہیں کیں، سوائے چند جملوں کے جو انھوں نے پاکستان کے قیام سے چند دن قبل کراچی کی ایک دعوت میں کہے تھے،" ہاں، میں کراچی میں پیدا ہوا تھا، اور بچپنے میں کراچی ہی کی ریتیلی زمین پر میں گولیاں کھیلتا تھا" بس اس زیادہ اور کچھ نہیں کہا۔

چند دنوں بعد ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو جب انھیں پاکستان کا گورنر جنرل مقرر کردیا گیا تھا، کراچی کارپوریشن کے دیے ہوئے ایک استقبالیے میں انھوں نے اپنے مولد کراچی کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔

"کراچی کوئی معمولی شہر نہیں۔ قدرت نے اس کو غیر معمولی فوائد سے نوازا ہے جو وقت کی جدید ضرورتوں سے میل کھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک معمولی سی بستی سے آج یہ اتنا بڑا شہر بن چکا ہے اور وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب اس کا شمار دنیا کے بڑے شہروں میں ہوگا۔ مجھے کراچی کا شان دار مستقبل نظر آرہا ہے، اس میں ہمیشہ سے لامحدود امکانات رہے ہیں، لہٰذا آئیے ہم سب مل کر اس خوب صورت اور عظیم شہر کو لین دین، تجارت اور صنعت، اور تعلیم و تہذیب کے گہوارے میں تبدیل کردیں۔"

جناح کی زندگی کا قصہ اور بہت سے واقعات سوانح نگار ہکٹر بولیتھو نے خوب لکھے ہیں۔ اپنی تفتیش کے دوران بولیتھو کی دو بزرگوں سے ملاقات ہوئی جو جناح بھائی کے پڑوسی رہے تھے۔ ایک خاتون اور ایک صاحب، دونوں اسّی کے پیٹے میں تھے۔ مرد بزرگ محمد علی جناح کے ہم مکتب تھے اور اپنے ذہن پر زور ڈال کر وہ اتنا یاد کر سکے تھے کہ "ہم دونوں گلیوں میں ساتھ گولیاں کھیلا کرتے تھے۔" بولیتھو صرف اتنی

بات سے کچھ مطمئن نہیں ہوئے اور انھوں ے اصرار کیا اور مردِ بزرگ سے کہا کہ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے ان شیشے سے بنی گولیوں پر توجہ مرکوز کریں۔ ان صاحب نے اپنی آنکھیں بند کیں اور اپنے ذہن کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ ان کی یادداشت میں اتنا اور بھی ہے کہ جب جناح ۱۴؍برس کے تھے اور ہم دونوں حسبِ معمول گولی کھیل رہے تھے کہ اچانک جناح نے مجھ سے کہا، ''مٹی میں گولیاں مت کھیلو، اس سے کپڑے بھی گندے ہوتے ہیں اور تمھارے ہاتھ بھی۔ ہمیں کھڑے ہو کر کرکٹ کھیلنا چاہیے۔''

بولیتھو کے مطابق نیونہام روڈ کے لڑکے فرمانبردار تھے: انھوں نے گولیاں کھیلنا ترک کر دیں اور جناح کی سرکردگی میں جناح کے بیٹ اور اسٹمپس سے گرد آلود گلیوں کو چھوڑ کر صاف ستھرے میدان میں کرکٹ کھیلنا شروع کر دیا۔ جب جناح انگلستان جانے لگے تو انھوں نے اپنا بیٹ اپنے دوست کو دے کر کہا، ''میری غیر موجودگی میں تم دوستوں کو کرکٹ کھیلنا سکھاتے رہنا۔'' کتنا خوب صورت واقعہ ہے۔ اگر یہ سچ نہیں اور بولیتھو بیان نہ کرتے تو بھی ایسے واقعات گھڑ لیے جانے چاہییں۔ شاید جناح کی زندگی کا یہ واقعہ ہی سب کچھ ہے جس کا نچوڑ ان الفاظ میں ملتا ہے ''گرد آلود جگہ چھوڑ دو تا کہ تمھارے کپڑے گندے نہ ہوں اور تمھارے ہاتھ ان کاموں کے لیے صاف رہیں جو انھیں کرنے ہوتے ہیں۔''

دوسری بات جو مجھے اس وقت سے الجھن اور حیرانی میں ڈالے ہوئے ہے، وہ یہ ہے کہ جب سے میں نے پاکستان کی تاریخ میں دل چسپی لینی شروع کی اگر چہ مجھے جلد ہی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ہندوستان کی جد و جہدِ آزادی میں محمد علی جناح کا کم و بیش ویسا ہی کردار تھا جیسا کہ نہرو اور گاندھی مگر، ہندو پاک سے باہر، ساری دنیا کے لوگوں کو آج بھی اس بات کی خبر نہیں۔ جب میں ساری دنیا کے لوگوں کی بات کرتا ہوں تو اس میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ صاحبانِ علم، مشہور تاریخ دان اور اہلکارانِ حکومت بھی اس زمرے میں آتے ہیں بلکہ ان میں بہتیرے تو ایسے بھی تھے جنھوں نے جناح کی تعریف کی ہے اور ہندوستان کی سیاست میں ان کے اہم کردار کو سراہا بھی ہے۔

مثال کے طور پر برطانوی حکومت میں امورِ ہندوستان کے وزیر مونٹاگو (Monatgue) نے پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے زمانے میں جناح کو ''کامل طور پر مہذب، پُر اثر شخصیت کا حامل اور زبان اور متاثر کُن لہجے سے پوری طرح لیس'' قرار دیا ان کے نزدیک، ''جناح ایک نہایت زیرک انسان ہے اور یہ سراسر زیادتی ہوگی اگر اس کو اپنے ملک کے امورِ مملکت چلانے کو موقع نہ ملے۔'' تو پھر ایسا کیوں ہے کہ دنیا والے اس کا ایسا دھندلا خاکہ دیکھ سکے جو ایک وقت ہندوستان کی ایسی سربرآوردہ شخصیات میں سے سمجھا جاتا تھا جنھیں چشمِ فلک نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کا سفیر، ایک عظیم آئینی ماہر، ایک ممتاز پارلیمانی مدبر، تیز دھار رکھنے والے دماغ کا مالک ایک بلند مرتبہ سیاست دان بیرسٹر، ہندوستانی انگریزی اشرافیہ کی جیتی جاگتی تصویر، مہذب، اپنے آپ میں مست، ہمیشہ بہترین لباس میں ملبوس، ایک آنکھ کے چشمے سے ہاتھوں کی لمبی لمبی ستواں انگلیوں سے کھیلتے رہنے والا، بانکی شخصیت کا انسان جو اگر چہ بے مثال انگریزی بولتا تھا مگر اپنے ملک کے لوگوں کی زبان سے نابلد جن کی بھلائی کے لیے جد و جہد اس کا شعار تھا، ایک چمک دمک سے عاری ماہرِفن، بدمزہ ازدواجی زندگی کا مارا ہوا جس کی خوب صورت بیوی اوائل عمری ہی میں داغِ مفارقت دے گئی تھی، ہمیشہ ایک دبلی پتلی کنواری لڑکی، جی جان سے اس کی ہم درد بہن، کے ہمراہ نظر آتا تھا۔ مختصراً، ہم درد اور رحم دل بزرگ کے بجائے، جذبات سے عاری، خشک مزاج افسر نما انسان یا یوں کہیے کہ طاقت استعال کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کا ماہر انسان۔

صرف یہی نہیں، مشہورِ زمانہ فلم ''گاندھی'' میں . جسے دنیا کے لاکھوں انسانوں نے دیکھا ہے اس سے بھی بُرے خد و خال میں پیش کیا جانے والا خاکہ جس میں کوشش کی گئی ہے کہ دیکھنے والا ''اس مسٹر جناح'' کے بارے میں اچھی رائے قائم نہ کر سکے، ایسا کیوں ہے؟

نہ صرف یہ کہ جناح اسکینڈلوں کے معاملے میں کوری زندگی رکھتے تھے، وہ کوئی زیادہ مجلسی انسان بھی نہیں تھے۔ تو کیا بین الاقوامی سطح پر اس قسم کی دھندلی تصویر اس وجہ سے بنی ہے کہ وہ اپنے ہم عصر سیاست دانوں، اور بعد میں آنے والے نسلوں کو اپنی زندگی کی کسی ڈرامائی

پیش کش سے متاثر نہیں کر سکے؟

جناح کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں سعد خیری لکھتے ہیں، ''ایک عام انسان، حقیقی کامیابیوں سے نہیں، فوجی نوعیت کی فتوحات حیران کُن مہمات اور افسانوی کامیابیوں سے متاثر ہوتا ہے عام طور پر لوگ عشروں پر محیط دورِ امن کو تو بھول جاتے ہیں مگر چند برسوں کی جنگیں اور تباہ کاریاں یاد رہتی ہیں، بندوں کی تعمیر نہیں یاد رہتی، سیلاب اور قحط کا ذکر نہیں بھولتے۔ ان کو مسولینی اور Garibaldi یاد رہتے ہیں Cavour ذہن سے محو ہو جاتا ہے حتیٰ کہ آئن اسٹائن ایٹم بم کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے، طبیعات میں اس کے کارناموں سے نہیں۔

جناح نے کسی فوج کی سالاری نہیں کی، فوجی جنگیں نہیں لڑیں نہ ہی وہ کسی ڈرامائی مہم میں شریک رہے جن سے قاری متاثر ہو سکتا۔ نہ انھوں نے مہاتما گاندھی جیسا کوئی اہنسا یا عدم تعاون جیسا کوئی نیا فلسفہ پیش کیا یا ایسے کام کیے جیسے کہ بکری کے دودھ پر گزارا کرنا، صرف دھوتی میں رہنا، چرخا کاتنا وغیرہ جس کو دیکھنے والا ان کی طرف راغب ہو۔ انھوں نے ایک سیدھی سادی زندگی اپنائی، اپنے لیے سیدھا راستہ متعین کیا، قول اور فعل دونوں میں راست بازی سے کام لیا۔ اس قسم کے کردار لوگوں کو اپنی جانب متوجہ نہیں کرتے۔ سادہ سچائیاں پرکشش نہیں ہوتیں، حقائق اکتا دینے والے ہوتے ہیں، افسانوی طریقے رنگ برنگے، دل چسپ اور جاذبِ نظر ہوتے ہیں۔

'' ظاہر ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے تو جناح کی زندگی ایک ایسے عام آدمی کے لیے سپاٹ تھی جو بار بار دہرائی جانے والے پروپیگنڈے پر اعتبار کر لیتا۔''

کچھ بھی ہو مجھے اس بات سے بہت چڑ اور شرمندگی بھی ہوتی ہے جب یورپ اور امریکا کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں کے پڑھے لکھے لوگوں کی زبان سے میں یہ سنتا ہوں کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی اور اس کی آخرِ کار کامیابی کا دارومدار دھوتی میں ملبوس ایک شخص کی ذات پر تھا، یعنی مہاتما گاندھی، جس میں تیسری دنیا کا ایک محبوب لیڈر پچاس سالہ انسان بھی شریک تھا جس کو لوگ جواہر لال نہرو کے نام سے جانتے ہیں۔

میرے خیال میں جناح کے انتقال پر لکھتے ہوئے ''ٹائمز'' اخبار نے مندرجہ الفاظ میں خوب لکھا تھا: ''مہاتما گاندھی کے مقابلے میں جناح کی شخصیت عجیب منظر پیش کرتی تھی۔ شاہانہ محلوں میں رہنے والے جناح، بلند قامت، نفیس لباس میں ملبوس ایک ممتاز اور نازک طبع انسان تھے۔ تیزی سے سفید ہوتے ہوئے بالوں سے ابھرتا ہوا ایک گچھا کلغی جیسا دکھائی دیتا تھا۔ اپنی نوابانہ ہیئت کی بنا پر ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسائل پر تحقیق کرنے والے مغرب کے محققین پر جناح اچھا تاثر چھوڑتے تھے، اس لیے کہ ان کی اپنی شخصیت کے رکھ رکھاؤ سے نظر آتا تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم تھے۔ ان میں سوچ کی وہ خفیف سے بھی لچک نہیں تھی، انگریز کے نزدیک جو ہندوؤں کا خاصّہ تھی۔ ان کے خیالات ہیرے کے مانند سخت اور ترشے ہوئے اور تقریباً دل چھو لینے والے محسوس ہوتے تھے۔ ان کا استدلال ہندوؤں جیسا گنجلک اور بل کھاتا ہوا نہیں بلکہ ایک خنجر جیسا کاٹ دار اور مخصوص مقام پر زخم لگانے والا انداز تھا۔''

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، کوئی بھی، اور اس میں پاکستان کی اکثریت شامل ہے، ہندوستان کی آزادی کے حصول کے ضمن میں گاندھی اور نہرو کی کوششوں کا منکر نہیں، اور ظاہر ہے کہ اس میں کانگریس کے ہندو لیڈر بھی شامل ہیں۔ مگر مجھے ذاتی طور پر اس بات سے بہت دکھ ہوتا ہے کہ دنیا والوں نے، نہ صرف مسلمانوں کے حقوق اور ان کے لیے ایک خود مختار ملک کے حصول بلکہ ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کی ہمالیائی کوششوں کی اتنی پذیرائی نہیں کی جس کی وہ حق دار ٹھہرتی ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا اس ملت کے بابائے قوم کی ناقدر شناسی اور اس کی مسخ شدہ تصویر ہی بنیادی وجہ تو نہیں جس کی بنا پر یہاں کے بہت سارے صاحبانِ عقل باسی آج بھی اس ملک کو اپنا وطن تسلیم کرنے اور اس سے منسلک اپنے تشخص کے بارے میں تامل کرتے ہیں۔ ہر شخص جناح کو قائدِ اعظم تسلیم کرتا ہے اور مانتا ہے کہ یہی وہ انسان ہے جس نے تقریباً تنِ تنہا ایک نئی قوم کی تشکیل کی تھی۔ وہ

لوگ بھی جو اس سے کلّی طور پر اتفاق نہیں کرتے تھے کم از کم بہ ظاہر اس پر معترض نہیں ہوتے۔ اگر چہ سرکاری ذرائعِ ابلاغ صبح سے شام تک اس کی شخصیت کے گُن گاتے رہتے ہیں مگر اس محمد علی جناح کے نہیں جس کو میں نے ان کتابوں میں پایا جس کو بڑے بڑے صاحبانِ علم نے تصنیف کیا ہے، یا جو اپنی تقریروں اور اپنے خطوط میں نظر آتا ہے۔ ممکن ہے میں غلط ہوں مگر خود پاکستان میں بھی ان کے سپوتوں کی شخصیات اور ان کی کارگزاریوں کے دو چہرے دکھائی دیتے ہیں، ایک تو سرکاری چہرہ ہوتا ہے اور دوسرا شبہات کے بادلوں سے جھانکتا ہوا، بالکل کسی مصور کی نہایت اعلیٰ اور قیمتی تخلیق کی طرح جس کو سورج کی کرنوں یا ضرورت سے زیادہ روشنی سے بچایا جا رہا ہو۔ ایک ایسی تصویر جو بین الاقوامی نظروں کے لیے نہ پوری طرح واضح ہے نہ صاف۔

کیا یہی وجہ تو نہیں کہ بہ حیثیت ایک قوم کے پاکستانی اپنے ہمسایہ ملک ہندوستان سے مسابقت کے موقعے پر دنیا کی رائے عامہ کے سامنے خود کو منوانے کی صلاحیت نہیں رکھتے؟

افسوس کہ بے شمار سوالات ہیں جن کے جوابات نہیں ملتے اور میں اپنے قارئین سے شرمسار ہوں کہ میں ایسے مسائل میں الجھتا چلا گیا ہوں جو میرے نزدیک قائدِ اعظم کی سوانحِ حیات اور اس سے بننے والے ان کی شخصیت کے خاکے سے مختلف ہیں۔ یہ افسوس کا مقام ہوگا مگر جناح کی بے پناہ خود تہذیبی اور فرائض کی بجا آوری کے جذبات میں مجھے کانٹ کی اصطلاح میں ضمیر کی آواز (بنیادی اخلاقی اصول) 'Categorical imperative' جناح کی صورت میں گوشت و پوست میں نظر آتی ہے گویا انھوں نے اپنے اصل کو دنیا کی نظروں سے اوجھل رکھنے کے لیے یہ انداز اپنایا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ جو کچھ بہ ظاہر نظر آتا تھا حقیقت اس کے برعکس رہی ہوگی۔ اس لیے کہ میری نظر سے ایسے شخص کے خیالات گزرے ہیں جو تقسیم ہند سے بہت پہلے سے قائدِ اعظم سے قریب تھا اور جس کو ان کے سیاسی نظریات اور سوچنے کے طریقے سے کافی واقفیت تھی، میری مراد یہاں لارڈ ولیم فرانسس لسٹو ویل سے ہے کہ جو برطانوی سرکار کے پرانے اور منجھے ہوئے سرکاری افسر اور سیاست داں رہے ہیں۔ انھیں برطانیہ کی سرکار میں ہندوستان اور برما کی وزارت کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے۔ جناح کے بارے یہ باتیں انھوں نے اس وقت کہیں تھیں جب اپریل ۱۹۴۸ء میں وہ لندن میں جناح مرحوم کے سلسلے میں منعقد ہونے والے ایک جلسے سے خطاب کر رہے تھے۔

''یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جب میں برطانوی حکومت میں وزیر تھا، کئی بار میری ملاقات قائدِ اعظم محمد علی جناح سے ہوئی۔ پہلی بار سرکاری نوعیت کی تھی جب وہ ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں مذاکرات کے لیے مسلم لیگ کے نمائندے کے طور پر لندن آئے ہوئے تھے۔ پھر آزادی کے بعد میں ان سے ان کی قیام گاہ پر ملا تھا جہاں ان کی بہن گھرداری کی ذمہ داری نباہ رہی تھیں۔ انھوں نے میرے قیام کو بہت پر سکون بنایا تھا۔ یہ ملاقات اگرچہ بہت مختصر مگر دل خوش کن تھی۔ محمد علی جناح سے گھریلو ماحول میں ملاقات تھی اس لیے کہ وہ مسلم لیگ کے نمائندے کے طور پر نہایت سخت اور نہ جھکنے والے انسان تھے مگر یہاں ایک مختلف انسان اور نہایت مہربان میزبان نظر آئے۔''

جناح کی سوانحِ حیات کے باقی ماندہ حصے میں یوں ہی قائدِ اعظم کو آسانی سے بیان کیا جاسکتا ہے اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ ان کی زندگی کے اس پہلو کے بارے میں اس شخص کو اچھی طرح معلوم ہوگا جس نے ان کے ملک کے معاملات میں ذرا بھی دل چسپی لی ہوگی۔

اس سے قبل ہم نوجوان مسٹر جناح کے اس دور کے بارے میں بات کر رہے تھے جب وہ بیرسٹری کی تعلیم کے لیے لندن گئے تھے اور ۱۸۹۶ء میں ہندوستان کے سب سے کم عمر بیرسٹر قرار پائے تھے۔ اسی برس وہ بحری جہاز سے کراچی واپس پہنچے جہاں کے حالات دگرگوں تھے۔ جب وہ انگلستان میں تھے تو ان کی بنیادی زبان انگریزی ہوگئی اور ان کی پوری زندگی میں یہی ان کی زبان رہی۔ اپنے مولد میں جو ایک صوبائی شہر تھا وہ خود کو اجنبی محسوس کرتے رہے اس لیے کہ وہاں کی تمدنی زندگی ان کی دانشورانہ مشاغل کے لیے ناکافی تھی۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا اور باپ قلاش۔ تو پھر ان کے لیے اس شہر میں کیا رہ گیا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں وہ بمبئی چلے گئے جہاں مزید تین برس کی مالی مشکلات اور

دوسری الجھنوں کا سامنا رہا تا آنکہ ان کی قسمت نے یاوری کی اور بمبئ پریزیڈنسی میں بحثیت مجسٹریٹ ان کا تقرر ہوگیا۔ ان کی پریشانیاں دو ہوگئیں اور خوش وخرم محمد علی جناح پر کامیابی کے آفتاب کی کرنیں پڑنے لگیں۔ انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی بہن فاطمہ جناح ک کراچی سے بمبئ بلا بھیجا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ان کو کیتھولک کالج میں داخل کرادیا۔ ان کا یہ قدم اس زمانے کے لحاظ سے عجیب مگر بہادری ک حامل تھا، جو سیاست داں محمد علی جناح کی پہچان بنا اور اس کو ہم اس روشنی میں ہی بہتر جانتے ہیں۔

جناح کو شہرت ملی اور مالی اعتبار سے ان کا شمار بمبئ کے کامیاب وکیلوں میں ہونے لگا۔

جناح نے آل انڈیا کانگریس کے رُکن کی حیثیت سے سیاست میں پہلا قدم رکھا، جیسا کہ اس زمانے کے ذہین اور دانشور نوجوان ہندو ہوں یا مسلمان، کرتے تھے۔ یہ ۱۹۰۵ء تھا، جب بنگال کی تقسیم ہوئی تھی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام سے ایک برس پہلے کا واقعہ تھا کانگریس کے عظیم اور اعتدال پسند رہنماؤں میں سے ایک گوپال کرشنا گوکھلے کے ہمراہ مستقبل میں مقامی حکومت کے لیے مشاورت کے لی جانے والے ایک وفد میں شامل ہوکر جناح انگلستان گئے۔ اپنے انگلستان کے قیام کے دوران جناح جن کے بڑے مداح تھے اُن ک دادابھائی نوروجی کے معتمد ہوگئے اور نوروجی کے برطانوی پارلیمنٹ کے پہلے ہندوستانی رکن بننے میں کام کرنے کے دوران ان کو سیاست ک عملی تجربہ ہوا۔ ۱۹۰۶ء میں کلکتے میں کانگریس کے اجلاس میں انھیں پہلی بار عوام کے سامنے آنے کا موقع مل چکا تھا اور وہ امپیریل لے جسلیٹ کاؤنسل کے رُکن منتخب ہو چکے تھے۔ ہندوستان کے سیاسی پلیٹ فارم سے ان کی سب سے بڑی کامیابی ۱۹۱۶ء میں کانگریس۔ لیگ معاہدہ تھ جس کو لکھنؤ معاہدے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ واحد معاہدہ تھا جو ان دو بڑے سیاسی اداروں کے درمیان، دو بڑی قوموں کی صورت میں ہوا تھا اور جناح کی ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کے نام سے تعریف ہوئی تھی۔ اس طرح ہندو اور مسلمان دونوں جناح کو ہندوستان کے بڑے رہنماؤں میں سے ایک گرداننے لگے۔ اور انگریزوں نے پہلی بار ان کی آواز کی توانائی کو محسوس کیا۔

ہندوستان کی سیاست میں مہاتما گاندھی اور ان کی ستیہ گرہ کے ظہور نے، جناح جس سے سمجھوتا کرنے میں خود کو تیار نہیں پات تھے، دونوں قوموں کے درمیان خلیج پیدا کردی۔ اس کے باوجود ۱۹۲۸ء کے قومی اجتماع میں جناح نے کہا تھا، ''ہمیں چاہیے کہ ہندو اور مسلمان اس وقت تک ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھیں جب تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔ دونوں قوموں کو اپنے اختلافات پس پشت ڈال کر متحد ہو جانا چاہیے کہ ہم دونوں کے مفادات ایک ہی نوعیت کے ہیں۔''

نہ صرف اس اجتماع نے ان کی تجویز اور ان کے مطالبے کو یکسر رد کردیا بلکہ پہلی گول میز کانفرنس میں بھی، جس میں جناح شریک تھے، ہندوستان کے دو مخالف گروہ متفق نہیں ہوئے۔ دل برداشتہ اور بے کیف جناح نے خود کو ہندوستان کے موجودہ حالات کے لیے ناموزوں پاتے ہوئے، اخبار ٹائمز کے مطابق، ''اپنے دوستوں سے کہا کہ ان کے نزدیک ہندوستان کی سیاست میں کوئی مناسب جگہ نظر نہیں آتی اس لیے انھوں نے لندن میں مقیم ہوکر پریوی کاؤنسل میں اس امید پر بیرسٹری کی پریکٹس شروع کرنے کا فیصلہ کیا کہ شاید ہندوستان کی آزادی کی جنگ کے لیے ان کی برطانوی پارلیمنٹ تک رسائی ہو جائے۔''

مسلمانوں کو جلد ہی گاندھی کے برابر بلند قامت رہنما کی کمی کا احساس ہوگیا۔ عمر میں جناح سے بیس برس چھوٹے، لیاقت علی خان نے، جو بعد میں پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم بنے، اور ان کی اہلیہ نے جناح کو ہندوستان واپسی اور مسلمانوں کی قیادت کے سنبھالنے پر ب مشکل راضی کرلیا اور بالآخر کئی بار ہندوستان اور انگلستان کے سفر کے بعد ۱۹۳۵ء کے اواخر تک انھوں نے حتمی فیصلہ کرلیا۔ جناح ہندوستان واپس آگئے اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے ان کی جدوجہدِ آزادی کی قیادت سنبھال لی۔

ان کا سب سے پہلا مسئلہ مسلمانوں کو ایک مرکز پر اکٹھا کرنا اور ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ذیل میں ۱۹۳۷ء میں ہونے والے انتخابات کی تیاری تھا۔ مسلم لیگ کی تاریخ میں پہلی بار انتخابات میں حصہ لینے کے لیے ایک مرکزی پارلیمانی بورڈ کا قیام عمل میں

یا تھا۔ کانگریس نے نمایاں کامیابی حاصل کی اور گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں مکمل اکثریت حاصل کر لی۔ لیگ نے ۴۸۴ میں سے ۱۰۸ نشستیں حاصل کیں۔ تعجب نہیں کہ کانگریس کے رہنما اس کامیابی کے نشے سے سرشار تھے، بالخصوص جواہر لال نہرو جنھوں نے لیگ کو جاگیرداروں اور وکیلوں کا جتھا قرار دے کر کہا تھا کہ ان کے دلوں میں غریب مسلمانوں کے لیے کوئی جذبات نہیں اور صحیح معنوں میں ان ریب عوام کا اگر کوئی مددگار ہے تو وہ صرف کانگریس کے رہنما ہیں۔

آہستہ آہستہ جناح کی ولولہ انگیز قیادت نے علی گڑھ کے علاوہ دوسرے شہروں کے طلبہ کو متحرک کرنا شروع کیا اور پارٹی کا ایک ھانچا بن گیا اور اس کی طاقت میں روز بہ روز ترقی ہونے لگی جس کے نتیجے میں پارٹی نے تین ضمنی انتخابات میں کامیابی حاصل کر لی۔ مشتعل نہرو بار بار مسلمانوں کے ''دو قومی نظریے'' پر حملے کرتے اور کہتے، ''اس ملک میں صرف دو پارٹیاں ہیں: کانگریس اور رطانیہ'' احتجاجی جواب میں جناح دہاڑتے، ''نہیں، یہاں ایک اور پارٹی ہے — مسلمان!'' جناح نے محسوس کیا کہ ان کو عوام کی حمایت اصل کرنی چاہیے اور اقبال کی عملی مدد سے یہ ممکن ہوا۔ انھوں نے نہ صرف عوام کی حمایت حاصل کی بلکہ ان کو راجا صاحب محمود آباد، ابوالحسن صفہانی، لیاقت علی خان جیسے ہمت والے مددگار بھی میسر آ گئے جن کی متحدہ کوششوں سے لیگ کو کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ باوجود اس کے کہ سلم لیگ کی باگ ڈور ایسے انسان کے ہاتھ میں تھی جو عوام کی زبان بھی نہیں بول سکتا تھا، مسلم لیگ ایک منظم اور عوامی طاقت سے لیس ماعت بن چکی تھی اور اپنی راست بازی اور کرشماتی شخصیت کی وجہ سے جناح ایک ایسے رہنما کے طور پر ابھرے جن کا مدِمقابل کوئی نہ تھا۔

لاہور میں ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے اجلاس میں مشہور قراردادِ پاکستان بلا کسی اعتراض کے منظور ہو گئی۔ جلاس کے اختتام پر جناح نے اپنے معتمد سے کہا، ''اقبال آج ہمارے درمیان موجود نہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ان کو یہ جان کر خوشی ہوتی کہ م نے بعینہٖ وہی کچھ کیا جو اُن کی خواہش تھی۔''

اب مسلمانوں نے اپنی قوم کے لیے باقاعدہ پاکستان کا مطالبہ کر دیا، کانگریس نے جس کا شدت سے انکار کیا اس لیے کہ اس کے ہنماؤں کو انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندو سلطنت کا خواب چکنا چور ہوتا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ واقعہ دراصل ہندوستان میں سلم نشاۃ الثانیہ کا ایک واضح اشارہ بھی تھا اور اس بات کا اعلان بھی کہ اب وہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں برابر کی شراکت داری کے ساتھ آگے بڑھیں گے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہماری تاریخ کا حصہ ہے اور عام طور پر سب ہی ان واقعات سے واقف ہیں، اس لیے کہ زیادہ تر ان کی نکھوں کے سامنے ہوا اور امید کی جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے تجربات اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کر دیے ہوں گے۔ سر اسٹیفرڈ کرپس مشن ۱۹۴۱ء کے فسادات، ۱۹۴۴ء کے جناح گاندھی مذاکرات، اور ۱۹۴۶ء میں شروع ہونے والا ناکام کیبنٹ مشن وغیرہ وہ اہم اور فیصلہ کن اقعات تھے جو اس زمانے میں ظہور پذیر ہوئے۔

۲ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو برطانوی حکومت کی دعوت پر جناح، لیاقت علی خان، جواہر لال نہرو اور بلدیو سنگھ برطانوی وزیرِ ہند سے ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر مذاکرات کے لیے لندن پہنچے۔ مذاکرات ناکام رہے اور اس وقت کے برطانوی وزیرِ اعظم ایٹلی نے ایک بیان جاری کر دیا جس میں کہا گیا تھا کہ جون ۱۹۴۸ء تک برطانیہ ''ذمے دار ہندوستانی ہاتھوں'' میں ہندوستان کی باگ ڈور تھما دے گا۔

اس کے بعد ہونے والی باتیں سب کو معلوم ہیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن آخری وائسرائے کے فرائض انجام دینے مارچ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان پہنچے۔ برطانوی راج کے آخری دنوں کے سرسری جائزے سے پتا چل جائے گا کہ ماؤنٹ بیٹن کی دلّی آمد کے دو ہفتوں کے اندر یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے اس کا بٹوارا ہی آخری نتیجہ ہوگا۔ اس لیے وائسرائے نے اپنے مختصر قیام کی ابتدا ہی سے اس رادے کی پردہ پوشی نہیں کی کہ ہندوستان کا بٹوارا ناگزیر ہو چکا ہے۔ وائسرائے لندن واپس گئے۔ حکومت سے تفصیلی مذاکرات کے بعد

برطانوی حکومت کا بیان ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو جاری ہوا جس میں انتقالِ اقتدار کے طریقے کا اعلان کیا گیا تھا۔

آخری لمحے تک ہندوستان کے بٹوارے کی کانگریس نے شدید مزاحمت کی اور گاندھی کا وہ مشہور جملہ ''پاکستان میری لاش پر ہی بنے گا'' اس بات کا ثبوت ہے۔ مگر جب ماؤنٹ بیٹن نے ''مسلم لیگ کو ختم کر دینے کی پٹیل کی دیرینہ خواہش'' کو استعمال کرتے ہوئے نہرو اور پٹیل کو بٹوارے پر راضی کر لیا تو گاندھی نے بھی اپنے ارادے بدل دیے۔

مسلم لیگ نے کسی سنجیدہ اعتراض کے بغیر جناح کو اختیار دے دیا کہ ۳ر جون کے سرکاری بیان کے مطابق ''بطور ایک سمجھوتے کے'' وہ ہندوستان کے بٹوارے کے منصوبے کو قبول کریں۔ آل انڈیا کانگریس نے منصوبے کو رد کرنے کی وکالت کی۔ یہ گاندھی کی مداخلت تھی کہ کانگریس نے آخر کار یہ قرارداد منظور کی کہ ''آل انڈیا کانگریس کو یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات ٹھنڈے ہو جائیں گے تو ہندوستان کے مسائل صحیح تناظر میں دیکھے جا سکیں گے اور نا درست دو قومی نظریہ غیر معتبر ہو جائے گا اور لوگ اس کو مسترد کر دیں گے۔''

جیسا کہ پروفیسر خالد بن سعید نے لکھا ہے، ''ایک دھما کے ساتھ نہیں بلکہ بسورتے ہوئے'' بٹوارا ہو گیا۔

۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو برطانیہ کے آخری وائسرائے ہوائی جہاز سے کراچی پہنچے اور اگلے دن ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو قائدِ اعظم محمد علی جناح، اپنی بہن فاطمہ جناح کے ہمراہ جلوس کی صورت میں اسمبلی کی عمارت میں داخل ہوئے جہاں جلالۃ الملک کی حکومت کے نمائندے کے طور پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک علامتی تقریب میں زمامِ اقتدار نئے قائم شدہ ملک پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت میں جناب جناح کے حوالے کر دی۔

جی الانا لکھتے ہیں، ''ہم پاکستانیوں کے لیے یہ ہماری آزادی کا دن تھا؛ قائدِ اعظم کے نزدیک یہ حصولِ کامیابی کا دن تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ منزلِ مقصود آ چکی تھی مگر جد و جہد کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔''

یہ جانتے ہوئے کہ وہ بہت علیل تھے، قائدِ اعظم کو جلدی تھی کہ نو زائیدہ ملک ان کے تصورات، منصوبوں اور معیار کے مطابق کام کرنے لگے۔ یہ ایک مشکل کام تھا، تفاوت کے خلاف جنگ تھی۔ جیسا کہ جناح نے کراچی کے گورنمنٹ ہاؤس میں ایک میٹنگ کے دوران لارڈ اِزمے (Lord Ismay) سے کہا تھا کہ ہندوستان نے ''پیدائش کے وقت ہی پاکستان کا گلا گھونٹ کر مار دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔'' یہ ان کی غیر معمولی قوتِ ارادی اور ان کے بلند عزائم تھے جنھوں نے ان کو کچھ عرصے تک زندہ رکھا۔ مگر آخرِ کار ایک مکمل طور پر خستہ اور جسمانی طور پر لاغر جناح کو اگست ۱۹۴۸ء میں، ملک کے حصول کے ایک سال بعد ہی، ملک کے معمار کی حیثیت میں نئے انتظامی ڈھانچے اور حکومت کی حکمتِ عملی کی ترتیب کے سلسلے میں اپنے صبر آزما کام کو روکنا پڑا۔ معالجین کے مشورے کے برعکس وہ برطانوی حکومت سے مذاکرات کے لیے گئے جہاں سے آرام اور اپنی کھوئی ہوئی جسمانی توانائی کے حصول کی خاطر صحت افزا پہاڑی مقام زیارت چلے گئے۔

ان کی آخری سرکاری مصروفیت بینک دولتِ پاکستان کا افتتاح تھا جس کے لیے وہ خصوصی طور پر ہوائی جہاز سے کراچی گئے تھے۔ ان کی زندگی کے آخری چند ہفتے کوئٹہ کی پہاڑیوں میں اپنی زندگی کی آخری جنگ لڑتے گزرے۔ فاطمہ جناح نے جناح کے انتقال کے چند مہینوں بعد لکھا تھا، ''وہ اپنے غموں میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے خاموشی سے، تن تنہا، آخرِ وقت تک تکلیف جھیلی، اور افسوس کہ ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی ان کی خواہش یہی تھی کہ وہ اپنی جنگ خود لڑیں۔ اپنی خوف ناک بیماری کی اطلاع کے بعد بھی وہ مکمل طور پر پُرسکون اور پریشانی سے مبرّا رہے۔ جس وقت ان کا انتقال ہوا، ان کے سرہانے سوائے میرے اور ان کے معالج کے اور کوئی موجود نہ تھا۔''

ان کا انتقال ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ سے واپسی پر کراچی میں ہوا۔ انھوں نے تقریباً ۱۰ بجے شب، جب وہ گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں سو رہے تھے، اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیں تھیں۔

جی الانا پہلے شخص تھے جو وہاں پہنچے۔ انھوں نے لکھا ہے،''جوں ہی میں نے سپید چادر کو دیکھا جس نے ان کے جسم کو ڈھانپ رکھا ھا، میں سمجھ گیا کہ اس دن، جب قوم کی عمر مشکل سے ایک برس کی تھی، قوم یتیم ہوگئی ہے۔ مجھے احساس ہوگیا کہ برصغیر نے مسلمانوں کے س عظیم رہنما کو جنم دیا تھا، وہ داغِ مفارقت دے گیا ہے۔ انھوں نے ہم کو ایسے وقت خیر باد کہا جب ہمیں ان کی زیادہ ضرورت تھی۔

۱۴راگست ۱۹۴۸ء کو قوم کے نام اپنے آخری پیغام میں انھوں نے فرمایا تھا،''آپ کی مملکت کی بنیاد رکھ دی گئی ہے اور اب یہ آپ و چاہیے کہ جتنی جلد ہو سکے اس کی تعمیر کریں۔''

جناح آخری وقت تک کام کرتے رہے۔ برطانیہ کے سابقہ وزیر برائے ہندوستان لارڈ پیتھک لارنس (Lord Pethik Lawrence) کے الفاظ میں،''گاندھی ایک قاتل ہاتھوں ہلاک ہوئے، جناح پاکستان کی وفاداری میں مرے۔'' دنیا نے مرحوم قائدِاعظم کی ہت خوب صورت الفاظ میں تحسین کی اور خراجِ عقیدت پیش کیے، خلوص آمیز بھی اور ایسے بھی جو مگر مچھ کے آنسو تھے مگر خوصورت الفاظ سے جائے گئے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے ایک دھڑے کے رہنما سورت چندر بوس نے ان کی ذاتی اور سیاسی کامیابیوں کے بارے میں نہایت امع اور دل کو چھو لینے والے الفاظ میں کہا تھا،''مسٹر جناح قانون داں کی حیثیت میں عظیم، ایک زمانے میں کانگریس کے رُکن کی حیثیت میں ظیم، مسلمانوں کی رہنمائی میں عظیم، بین الاقوامی سطح پر سیاست اور سفارت کاری میں عظیم، اور باعمل انسان کے طور پر سب سے عظیم تھے۔ مسٹر ناح کے انتقال میں دنیا نے ایک عظیم ترین مدبر کھویا، اور پاکستان نے اس کو زندگی بخشنے والا، فلسفی اور رہنما۔'' صدی کی چالیسویں دہائی کے صلہ کن برسوں میں ہندوستان کی سیاست میں عملی طور پر خود حصہ لینے والے شخص ایچ وی ہوڈسن نے The Great Divide کے عنوان سے یک بہت اہم اور لاجواب کتاب لکھی ہے۔ انتقالِ اقتدار کے تاریخی عمل کا ذکر کرتے ہوئے جس میں جناح نے کردار ادا کیا، انھوں نے لکھا ہے:

''ہندوستان کی آزادی کے عظیم کھیل میں حصہ لینے والی تمام شخصیتوں میں محمد علی جناح سب سے اہم اور متحیر کر دینے والی شخصیت تھے۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ تمام اہم اداکاروں میں (مہاتما گاندھی کے علاوہ جو وقفے وقفے سے اور غیر فیصلہ کن انداز میں ظہور کرتے رہے) وئی دوسرا بھی یہ کردار ادا کر سکتا تھا، ایک مختلف کانگریسی رہنما، ایک مختلف وزیرِ مملکت برطانیہ، قوموں کے مختلف مفادات کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ان کے نمائندے، حتیٰ کہ ایک مختلف وائسرائے بھی، تب بھی کھیل کا انجام کچھ مختلف نہ ہوتا۔ لیکن ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ الات اسی نہج پر جا رہے ہوتے، آخری جد و جہد کے کردار تین ہی ہوتے دو متوازن حریف نہیں اور یہ کہ ایک نئی مملکتِ پاکستان وجود میں جاتی، اگر مسٹر جناح کی شخصیت اور رہنمائی شامل حال نہ ہوتی۔''

# ایک نئی مملکت کا ظہور

## کامیابی یا غیر فیصلہ کن برابری؟

تقریباً تین برس قبل اس ملک نے اپنی پچاسویں سالگرہ منائی ہے۔ بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں اور پاکستان کے تمام اہم اخباروں نے موقعے کی مناسبت سے ضمیمے شائع کیے ہیں۔ یہاں وہاں سے تاریخ دانوں کے تذکرے، ماضی کے عظیم دانشور بزرگ افراد کے اقوال اور کھرددرے مزاج کے نوجوانوں کی آنکھیں کھول دینے والے، محرومی اور استہزا سے پُر مضامین بھی شائع ہوئے ہیں۔

جیسا کہ جناب محمود ہارون نے لکھا ہے، ''اب وقت ہے کہ ہم ماضی اور مستقبل دونوں میں جھانکیں۔'' جلی سرخیاں، جو ہر ایک کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہوں، فضا میں ایک خفیف سی افسردگی مگر زیادہ اطمینان بھی نہیں ہونا چاہیے۔ جب جوش وخروش کی ضرورت ہو اس وقت یک گونہ اُداسی یا غمگینی کے ساتھ طنز بھی شامل ہو جاتا ہے، جیسے پروانے جلتی ہوئی شمع کی طرف اس طرح جاتے ہیں گویا جل جانے میں ہی ان کی نجات مضمر ہو۔

''اسلام آباد ڈائریز'' کے عنوان سے لکھنے والے صحافی ایاز امیر اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں، ''کیا ہم ایک دن کے لیے کراہنا اور شکایت کرنا بند نہیں کر سکتے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایسی اولاد سے جو اپنے چہیتے بزرگوں کا یومِ پیدائش بڑے احتشام سے منا رہی ہو، تقابل کرتے ہیں کہ ہم بحیثیت ایک قوم کے اپنے عظیم دن کو کس طرح منا رہے ہیں۔ وہ کیا خوب لکھتے ہیں، ''شاید سالگرہیں جذباتی ہونے ہی کے لیے ہوتی ہیں، اور اگر ممکن ہو تو خوشی کے لیے۔ یہ ایسے مواقع نہیں ہوتے جب ہم نفع ونقصان کا میزانیہ بنانے لگیں۔''

اور خوشی کے لیے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ بہت کم ملک ایسے ہوں گے جنھوں نے اتنے لامتناہی، اندورنی اور بیرونی مسائل بھگتے ہوں گے جتنے کہ پچاس برسوں میں پاکستان کو درپیش رہے ہیں۔ اس کی پیدائش خوں ریزی میں ہوئی جو 'عظیم تقسیم' کے فوراً بعد شروع ہوگئی تھی، جب اس کے لیے قابلِ ذکر مالی وسائل بھی نہیں تھے، اور بحیثیت ایک خود مختار ملک کے اس کی تمام عمر بے تحفظی، مخالفت اور ٹکراؤ ہی میں گزری ہے۔ اس کے وجود میں بہت پہلے ہی سے تماشائیوں، تبصرہ نگاروں، بھلائی چاہنے والوں اور دوسرے لوگوں کو نہ صرف یہ شک تھا کہ یہ مملکت باقی بھی رہے گی یا نہیں بلکہ کچھ تو اس کی جلد ''موت'' کی پیشین گوئی بھی کر چکے تھے۔ پروفیسر رِشتر (Prof. Richter) کے الفاظ میں ''اتنے سارے مسائل اور پیشین گوئیوں کے باوجود اس ملک کا باقی رہنا ہی خوشی منانے کا کافی جواز پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان اس درجے کے معاشی اور سیاسی مسائل سے دوچار رہا ہے جو بڑے بڑے سوالات کو جنم دیتے ہیں۔ پچھلے ایک برس میں پاکستان دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ سماجی افراتفری، تشدد، بددیانتی اور تحفظ کے مسائل کا شکار رہا ہے۔ میرے خیال میں بار بار ایسے مسائل کے سر اُٹھانے کی وجہ ہی تھی کہ اخبار ڈان کے اداریے لکھنے والوں نے سوال اُٹھایا تھا کہ ''کیا پاکستان ایک ناکام ریاست ہے؟''

میں پروفیسر رِشتر سے کلّی اتفاق کرتا ہوں جب وہ اس سوال کی مناسبت کا سوال اُٹھاتے ہیں جس کے بارے میں ان کا خیال تھا

کہ اگر وہ خود اس نوعیت کا سوال اُٹھاتے تو اس کے لیے دوسرے الفاظ استعمال کرتے۔ اس لیے کہ 'ناکام ریاست' 'نرم ریاست' 'از کار رفتہ' وغیرہ بہت آسانی سے مبہم جملوں کے زمرے میں آ جاتے ہیں بالخصوص اس وقت جب باہر کے مبصرین، جیسے کہ اس کتاب کے مصنف، ان کو استعمال کرنے لگیں۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان اور ہندوستان اپنی ''تقدیر سے ہم آغوش'' ہوئے، انسانوں کی بنائی ہوئی سرحدوں کے دونوں جانب کے محبانِ وطن نے نو یافتہ آزادی پر خوشیاں منائیں۔ لوگوں کے دلوں میں ایک قسم کی سرفرازی جاگزیں ہوگئی جب ان کے رہنماؤں نے قومی عظمت اور مستقبل کے امیدوں بھرے سہانے خواب دکھائے۔

ان دنوں سب سے اہم اور قابلِ ذکر جناح کی وہ تقریر تھی جو انھوں نے مجلسِ دستور ساز کے پہلے صدر منتخب ہونے پر ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو کی تھی۔ وہ تقریر اس تاریخی دن ہی نہیں بلکہ آج بھی سننے والوں کے دلوں کو گرما بھی دیتی ہے اور اس پر گرما گرم نا قابلِ تصور بحثیں بھی ہوئیں اور سیاسی جوڑ توڑ بھی۔

''آپ جانتے ہیں کہ صرف ہم لوگ ہی نہیں بلکہ میرے خیال میں، پوری دنیا اس بے نظیر طوفانی انقلاب پر انگشت بدنداں ہے جس نے برِصغیر میں دو مطلق العنان مملکتوں کے قیام کو ممکن بنا دیا ہے۔ جو کچھ ہوا، تاریخ میں اس کے متوازی مثال نہیں ملتی۔ یہ طاقتور برِصغیر، اپنے تمام باسیوں سمیت ایک ایسے منصوبے کے تحت ہے جو دیو پیکر بھی ہے اور بے نظیر بھی۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ منصوبہ پُر امن اور عظیم ترین عملِ ارتقا کے ذریعے انجام کو پہنچ گیا۔''

''اس ایوان کے سب سے پہلے اجلاس کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسے موقعے پر کوئی بڑا اعلان نہیں کر سکتا مگر میں اپنے ذہن میں آنے والی چند باتیں ضرور کہنا چاہوں گا۔''

''سب سے بڑی لعنت ہے رشوت اور بدعنوانی۔ یہ سچ مچ زہر ہے۔ ہمیں اس کو آہنی پنجوں سے زیر کرنا ہوگا اور مجھے امید ہے کہ جتنی جلد ہو سکے آپ اس ضمن میں ضروری اقدامات کریں گے۔ چور بازاری بھی ایک لعنت ہے۔ جو دوسری بات مجھے نظر آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ بھی ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ دوسری چیزوں کے ہمراہ، اچھی اور بُری، جو بڑا فتنہ ہمیں ملا ہے وہ اقربا پروری اور بے ایمانی ہے۔ ہمیں اس کو بے دردی سے کچل دینا ہوگا۔

میں یہ پوری طرح واضح کر دینا چاہوں گا کہ میں کسی قسم کی بے ایمانی، اقربا پروری یا براہ راست یا بلا واسطہ مجھ تک آنے والی سفارش کو کبھی برداشت نہیں کروں گا۔ میں جہاں بھی اس رواج کی شروعات دیکھوں گا، یا جہاں یہ پہلے سے رائج ہو، اونچے طبقے میں ہو یا نچلے طبقے میں، میں ہرگز اس کی حمایت یا طرف داری نہیں کروں گا.....''

''اب اگر ہم اس عظیم مملکتِ پاکستان کو خوش حال اور پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں تو ہم کو لوگوں کی بہتری پر پوری توجہ دینی ہوگی، بالخصوص عوام اور غریبوں کی۔ اگر آپ نے، ماضی کو پس پشت ڈال کر، ہتھیار پھینک کر ہاتھ بٹایا تو آپ کی کامیابی یقینی ہوگی۔ اگر آپ اپنے ماضی کو بدل دیں اور آپ سب مل کر اس جذبے کے ساتھ کام کریں کہ ہر شخص، اس سے قطعِ نظر کہ وہ کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے، ماضی میں اس سے آپ کے کیا رشتے تھے، وہ کسی رنگ کا ہو، کسی ذات یا نسل کا ہو، پہلا، دوسرا یا آخری ہو، مملکت کا باشندہ ہے جس کے برابر کے حقوق، استحقاق اور فرائض ہیں تو آپ کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔ میں اس سے زیادہ زور نہیں دے سکتا۔ ہمیں اس طریقے پر عمل شروع کر دینا چاہیے اور وقت آئے گا جب اکثریت اور اقلیت کی ساری پہلوداریاں غائب ہو جائیں گی۔''

''لہٰذا ہم کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ آپ آزاد ہیں، آپ کو اپنے مندروں میں جانے کی آزادی ہے، اس مملکتِ پاکستان میں آپ اپنی مسجدوں میں یا کسی اور عبادت گاہ میں جانے میں آزاد ہیں۔ آپ کسی مذہب سے ہوں، کسی ذات سے ہوں یا کسی نسل سے،

سرکاری کاروبار کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ اب ہمیں اسی بات کو اپنے معیار کے طور پر اپنے سامنے رکھنا چاہیے، اور آپ دیکھیں گے کہ ایک وقت وہ آئے گا جب مذہبی معنوں میں، نہ ہندو ہندو رہیں گے نہ مسلمان مسلمان، اس لیے کہ یہ ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہوتا ہے، مگر سیاسی اعتبار سے سب اس مملکت کے باشندے ہوں گے۔"

جس وقت جناح صاحب نے طاقتور اور مستقبل نما تقریر کی تھی وہ خوب جانتے تھے کہ انھوں نے اور ان کے لوگوں نے اپنی قوم کے لیے زمین کا ایک وسیع رقبہ تو حاصل کر لیا ہے مگر ضروری حکومتی ڈھانچا نہیں ملا ہے اور راتوں رات اس کو بنانا ہوگا۔ برطانوی ہندوستان کا پرانا دارالحکومت نئی دلّی، اپنی تمام عوامی عمارتوں اور سرکاری افسران و کارکنان سمیت سب ہندوستان کو مل گیا ہے۔ پاکستان کے منتخب دارالحکومت کراچی میں، جو سندھ کا مرکزی شہر اور بندرگاہ تھا، فوجی بیرکوں اور شامیانوں میں دفاتر بنانے پڑے تھے۔ اس پر مستزاد یہ بھی کہ نئی قوم کے خزانے خالی تھے اس لیے کہ ہندوستان کے اثاثوں کے بٹوارے کا فیصلہ دسمبر ۱۹۴۷ء تک ہوا تھا جس میں پاکستان کو زرِ مبادلہ کا سترہ اعشاریہ پانچ فی صد ملنا تھا جو ہندوستان کے پاس تھا۔ اسی طرح غیر منقسم ہندوستان کے پاس جو نقد رقم تھی اس کا بھی اتنا ہی فی صد پاکستان کو ملنا تھا اور اسی تناسب سے سارے اثاثے بٹنے تھے۔ اس فیصلے کے باوجود نقد رقم اس وقت تک نہیں ملی تھی جب تک کہ مہاتما گاندھی نے "مرن برت" رکھنے کی دھمکی نہیں دے دی تھی۔ اس دھمکی نے کانگریس کے رہنماؤں کے مزاحمتی انداز کو تبدیل ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ نظام حیدرآباد کی فیاضی تھی جس نے ملک کو مالی بحران سے نکالا اور قبل از وقت انہدام سے بچایا، افسوس کہ بہت سے اہم کانگریس کے رہنما جس کے انتظار میں تھے۔

ان دو حکومتوں کو جن بڑے مسائل کا سامنا تھا ان میں سے ایک قتل و غارت گری کو روکنا تھا جو تیزی سے ہندوستان کے کئی حصوں میں پھیلتی جا رہی تھی اور تقسیمِ ہند کے بعد ایک حقیقت بن کر سامنے آئی تھی۔ نتیجے کے طور پر ایک اندازے کے مطابق ۱۰ سے ۱۴ ملین لوگ اُجڑ گئے۔ انھوں نے اپنے گھر بار چھوڑ کر نئی سرحدوں کے پار پناہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ پا پیادہ، بیل گاڑیوں میں، ریل گاڑیوں کے ذریعے، ہوائی جہاز، بحری جہاز اور کاروں کے ذریعے بھاگ رہے تھے۔ ان میں سے بے شمار مارے گئے، ذبح ہوئے، زنا بالجبر اور تشدد کا شکار ہوئے۔ یہ شاید کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ حقیقتاً کتنے لوگ اپنی جانوں سے گئے، کچھ لوگ اندازہ لگاتے ہیں کہ دس لاکھ کے لگ بھگ رہے ہوں گے۔

یہ تھے واقعات وہ جنھوں نے شدت کے اعتبار سے غیر متوقع طور پر دونوں حکومتوں کو متاثر کیا تھا، مگر پاکستان کے کم زور معاشی اور سماجی حالات کو تو گویا ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بادی النظر میں یہ ایک معجزے سے کم نہیں کہ یہ قوم اور اس کے رہنما کس طرح نہ صرف لوگوں کی دیکھ بھال کر سکے ان کو غذا فراہم کر سکے بلکہ لاکھوں بے گھر لوگوں کو سایہ فراہم کر سکے جو اپنی زندگی کی ضروریات کو اپنا حق سمجھ کر اس ملک میں پناہ گزین ہوئے تھے۔

نہ صرف اس ملک کے اندر کا بلکہ باہر کا بڑے سے بڑا خوش فہم اتفاق کرے گا کہ یہاں سب کچھ اچھا نہیں تھا، پھر بھی سب کچھ بُرا بھی نہیں تھا۔ جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان نے آزادی حاصل کی، ایسا لگتا تھا جیسے اس کے معاشی حالات بہت دگر گوں ہوں گے جن کا کوئی حل نہ ہوگا۔ اب، اس کی پچاس برس سے زیادہ کی خود مختار تاریخی عمر میں شاید سب سے کامیاب واقعہ سیاسی نہیں بلکہ معاشی میدان میں کامیابی ہے ہندوستان کے برعکس جو استقلال کے ساتھ حکومت کے زیرِ نگرانی سوشلسٹ طرز کی معیشت کی طرف پیش قدمی کرتا رہا ہے، پاکستان ۱۹۴۸ء میں متعین کی ہوئی اپنی پالیسی کو تبدیل کرتا رہا ہے اور یہاں ملی جلی معیشت نے جڑیں پکڑی ہیں جس میں نجی ملکیت زیادہ طاقتور ہو کر ابھری ہے اور غیر ملکی سرمایہ کاری کو زیادہ فروغ ملا ہے۔ ساتویں عشرے میں اس طرزِ معیشت کو ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں دھچکا پہنچا جب بڑی بڑی نجی صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ اب، نئی صدی کی ابتدا میں، پاکستان کے منصوبہ بندی کرنے والوں اور صاحبانِ اقتدار

کواس بات کا احساس ہوا ہے کہ جولوگ پانچویں اور چھٹی دہائی میں پاکستان کی کامیابی کے ہراول دستے سے تعلق رکھتے تھے جن کو ساری دنیا
میں سراہا گیا تھا، ان کی کامیابیوں کے راز کیا تھے۔

جب پاکستان وجود میں آیا اس وقت فضا امیدوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی اور تباہی کی پیشین گوئی کرنے والوں کو اپنے الفاظ
واپس لینے پڑے تھے جب ان کی توقعات کے مطابق بجائے تباہی کے پاکستان میں باقی رہنے کی صلاحیت اور امنگ موجود نظر آتی تھی۔ اس
کوشش میں بہت سی عظیم شخصیات نے ہاتھ بٹایا ہے اور جیسا کہ اس کتاب کے قارئین کو جلد ہی احساس ہو جائے گا، میں نے آنے والے
ابواب میں بہت سے لوگوں کے خاکے شامل کیے ہیں جو نہ صرف پاکستان کی تخلیق، اس کی معاشی ترقیات میں شامل رہے ہیں بلکہ ''ایسٹرن
فیڈرل یونین انشورنس'' کی تاریخ میں بھی حصے دار رہے ہیں۔

افسوس کا مقام ہے کہ جب ہم پاکستان کے سیاسی، عمرانی اور معاشیاتی مستقبل میں دیکھنے کو کوشش کرتے ہیں تو ہمیں وہ پرانی
پاکستانی روح، وہ متحرک جذبے، خوش گمانیاں اور بنیادی امنگیں نظر نہیں آتیں جو شروع میں ہر طرف دکھائی دیتی تھیں۔ میرا ذاتی تجربہ مجھے
کچھ اور ہی بتاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس ملک کے نوجوان طبقے میں بد دیانتی، نالائقی، اور جاگیرداری یا اقربا پروری کے ذریعے استحصال کے
معاملے میں صبر کی بہت کمی ہے۔ مگر ان کو یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ اس ملک نے پچھلے پچاس برسوں میں ترقی بھی کی ہے اور اس کے
حالات بہتری کی طرف گامزن رہے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف معترض ہیں بلکہ اپنے رہنماؤں سے اپنے مطالبات کے معاملے میں شدت پسند
بھی ہیں، اس لیے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کو مستقبل میں ملک کی بھلائی کے لیے کچھ کرنا چاہیے بجائے اس کے کہ وہ بد دیانتی کے بہانے
حکومتوں کو گرانے میں اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے میں لگے رہیں یا شکست خوردہ لوگوں کو عوامی نفرت کے چوکھٹے میں سجائے رہیں۔ یہ
لوگ (یعنی نئی نسل) مزید معاشی ترقی، معاشرتی انصاف چاہتے ہیں اور معاشرے کی سب سے بڑی خرابی جہالت، کا معتد بہ علاج مانگتے ہیں۔
یہ ایسے سیاسی رہنماؤں کے تمنائی بھی ہیں جو ہنر مند ہوں، دیانت دار ہوں، دور اندیش ہوں اور جن کا بنیادی ہدف اپنے قبیلے کا مفاد نہ ہو، جو
اپنے سیاسی مدِمقابل پر کیچڑ اچھالنا ہی اپنی فرض نہ جانتے ہوں اور اپنے ملک کی خرابیوں کے لیے دوسروں اور باہر والوں کو موردِالزام ٹھہرانے
والے نہ ہوں، ایسے لوگ ہوں جو مستقبل کے پاکستان کے لیے ایک واضح تصور رکھتے ہوں۔ ایسے ملک کا تصور جس پر فخر کیا جا سکے، جہاں
انسان با عزت طور پر کام کاج کر سکے، اور جیسا کہ غیر منقسم ہندوستان کے بڑے سرکاری افسران میں سے ایک جناب عباس خلیلی نے
مسلمانوں کے نئے وطن پاکستان ہجرت کا فیصلہ کرنے سے قبل ایک بار کہا تھا:

''ہندوستان کی تقسیم کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو'' لارڈ لسٹو ویل نے اپنے دوست ایچ وی ہوڈسن کو دہراتے ہوئے کہا تھا، ''اکثر
ہم ایسے سوال کے نرغے میں ہوتے ہیں جس کا کوئی حتمی جواب نہیں ہوتا، اس لیے کہ تاریخ میں دیے گئے تمام امکانات فرضی اور سراسر ناقابلِ
پیشین گوئی ہوتے ہیں۔ کیا برطانوی راج کے بعد ہندوستان کے باسیوں کے مستقبل کے لیے تقسیم ہی بہترین حل تھا؟ برطانوی راج کے
آخری لمحے تک، جب ماؤنٹ بیٹن اور ایٹلی نے برصغیر کو تقسیم کر دینے کا ناگزیر فیصلہ کیا تھا، برطانیہ کے زیادہ تر لوگوں کے نزدیک تقسیم ایک
ایسی خرابی تھی جس کو ہر قیمت پر روکا جانا چاہیے تھا۔ لیکن اگر ہم فاصلے سے دیکھیں تو اس کو ایک کم نظر فیصلہ کہہ سکتے ہیں لیکن یہ ایک خود پسند
سیاسی منظر ہوگا۔ ہم اب بادی النظر میں صاف دیکھ سکتے ہیں کہ معاشی وسائل کی کمی، سیاسی تجربے یا قومی یک جہتی کی کمی کے پیشِ نظر پاکستان
کی تباہی کی پیشین گوئی کرنے والے غلط تھے۔ تباہی کے پیغمبروں نے مسلمانوں کے جذبات کو کمتر سمجھا تھا جو مسلم علیحدگی کی تحریک کے دوران
ابھرے تھے، بالخصوص اس بڑھتے ہوئے قومی احساسِ تفاخر اور شناخت کو جو تحریک کے آگے بڑھنے کے ساتھ بڑھتا گیا تھا۔''

جناح نے اپنی ۱۱ راگست ۱۹۴۷ء کی تقریر میں یہ سوال خود بھی اُٹھایا تھا جس کو میں نے پچھلے صفحات میں نقل کیا ہے۔ اور پاکستان کی
تاریخ سے پُر کتب خانوں کی خاک چھاننے کے بعد میں صدقِ دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں اُس جواب سے بہتر جواب نہیں دے سکتا جو

قائدِ اعظم نے دیا تھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو ہندوستان کی تقسیم سے اتفاق نہیں کرتے۔ دو گروہوں کے، جن میں ایک اکثریت ہے دوسرا اقلیت، مختلف احساسات کو سمجھا جا سکتا ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن تھا کہ جو کچھ ہوا اس سے مختلف کچھ ہو سکتا؟ تقسیم تو ہونی تھی۔ پاکستان اور ہندوستان، دونوں جانب ایسے حلقے بھی تھے جو اس سے متفق نہیں تھے، جو اس کو (تقسیم کو) پسند نہیں کرتے تھے، مگر میری دانست میں اس کے علاوہ کوئی اور حل تھا ہی نہیں اور مجھے یقین ہے کہ تاریخ اس کے حق میں اپنا فیصلہ سنا دے گی۔ متحد ہندوستان کا کوئی بھی تصور کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا اور میری دانست میں ایسا حل ہمیں بڑی تباہی کی طرف لے جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اندازِ نظر صحیح ہو، ہو سکتا ہے صحیح نہ ہو، یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ ہاں! اس تقسیم کی وجہ سے اس سوال سے اجتناب ممکن نہیں ہوا کہ اقلیت اس عملداری میں رہے یا اُس عملداری میں۔ اب تو اس سے اجتناب ممکن نہیں رہا۔ اس کا اور کوئی حل نہیں ہے۔''

میرے خیال میں، پاکستان کے حصول، اس کی بقا اور اس کی ترقی کے لیے کی جانے والی جنگ، برابری پر ختم نہیں ہوئی ہے، مگر اس میں ابھی کسی کی جیت بھی نہیں ہوئی ہے، جنگ ابھی جاری ہے۔ امکانات اس کے حق میں ہیں، اور میں قائل ہوں کہ ابھی جیت کے لیے بنانے والے ''رنز'' کے لیے کافی ''اوور'' باقی ہیں۔

دوسرا باب

# ای ایف یو
## اور پاکستان میں اُبھرتی ہوئی انشورنس کی صنعت کاری

اگر ہم پچھلی پانچ دہائیوں پر نظر ڈالیں تو ہمارے لیے اس دور میں ہونے والی پاکستان کی صنعتی ترقی سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ پاکستان کی جسامت اور اسے ملنے والی انسانی دولت کے پیشِ نظر بلاشبہ ہمیں کچھ زیادہ خوش بھی نہیں ہونا چاہیے۔ پھر بھی، اگر ہم تقسیم کے وقت پاکستان کو ورثے میں ملنے والی کم زور معیشت کو سامنے رکھیں تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ نصف صدی کے قلیل عرصے میں پاکستان بہت آگے بڑھا ہے۔ ملک کی پچاسویں سالگرہ کے موقعے پر مختلف مصنفین نے جتنے مضامین اور تذکرے لکھے ہیں، متفقہ طور پر سب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے۔

پاکستان کی تحریک کے دوران جو سب سے بڑا اعتراض کیا جاتا تھا، وہ یہ تھا کہ یہ نیا ملک معاشی اعتبار سے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس ملک کی معاشی ترقی کی راہ میں بہت مشکلات آئیں۔

جیسا کہ جناح صاحب نے اپنے ۱۴راگست ۱۹۴۸ء کے پیغام میں کہا تھا، ''مختلف طریقوں سے نئی مملکت کے پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد بھی ہمارے دشمن اس تاک میں تھے کہ وہ معاشی داؤ پیچ سے اپنے ہدف کو حاصل کر لیں گے۔ اپنے تمام تر مذموم حربوں کی مدد سے ان لوگوں نے یہ پیشین گوئیاں کر رکھی تھیں کہ پاکستان دیوالیہ ہو جائے گا۔ دشمن جو کچھ آگ اور تلوار کی مدد سے حاصل نہ کر سکا تھا، ملک کو مالی طور پر کھنڈر بنا کر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر ان بَدی کے پیمبروں کو منھ کی کھانی پڑی ہے۔''

عوام کی بلند توقعات کے مقابلے میں ملک کی بنیاد رکھنے والے رہبروں کے سامنے بڑے مشکل معاشیاتی مسائل تھے۔ ان کو قلیل اور کم درجے کے وسائل کی مدد سے ہی سے سب کچھ بنانا تھا۔ دراصل تقسیم سے قبل کے ہندوستان میں غیر منصفانہ معاشی مسائل ہی تو تھے، مسلمانوں نے اپنی زمین اور الگ مملکت کے حصول کے ذریعے جن کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔

جیسا کہ میں اس کتاب میں پہلے کہیں لکھ چکا ہوں، جناح کے سب سے قریبی مددگار مرزا ابوالحسن اصفہانی نے، جو ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے رُکن رہے تھے، تقسیم ہند کے وقت کے معاشی حالات کے بارے میں لکھا تھا:

''تجارت اور صنعت کاری پر ہندو بنیا اور برطانوی صنعت کاروں اور تاجروں کا راج تھا۔ پٹ سَن، کپاس، چائے، کانکنی، انجینئرنگ وغیرہ جیسی بڑی صنعتوں میں برطانویوں کے حصص تھے۔ خام کپاس اور پارچہ بافی کی صنعت میں بھی ان کا حصہ بہت زیادہ تھا۔ قرض ادھار سے لے کر خام یا تیار شدہ اشیا، ہر قسم کی مصنوعات کی اندرونِ ملک تجارت اور زیادہ تر صنعتیں ہندوؤں کے قبضے میں تھیں۔ مسلمان کا گزارا تو ان اجارہ داروں کے دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑوں ہی پر تھا۔ یہ اجارہ دار، امیر صنعت کار اور بنیے، پٹ سَن، کپاس اور اناج کی فصلیں اونے پونے دام خرید لیتے اور اس طرح ہر سال ان کی تجوریاں بے پناہ منافع سے ابلنے لگتیں۔''

''ہر ماحول میں برائیوں کی طرح کچھ اچھائیاں بھی ہوتی ہیں، اس لیے برطانوی اور ہندو اجارہ داروں اور صنعت کاروں میں اچھے لوگ بھی تھے۔ اِکا دُکا صنعت مسلمانوں کی بھی تھی۔ کچھ میمن، خوجے اور بوہرے بھی تھے جو اناج، کپڑے اور مشینوں کے پرزہ جات کی خوردہ خرید و فروخت میں ہندو بنیوں کے مقابل تھے اور انھوں نے کامیابیاں بھی حاصل کی تھیں مگر یہ کیفیت اتفاقی ہی تھی اور ایسی مسابقتوں سے ہندوستان کی معاشی بساط پر قابلِ ذکر اثرات مرتب نہیں ہو سکتے تھے۔ عام طور پر مسلمان مفلس ہی تھے اور ان کے لیے ترقی اور حالات کے سدھار کی راہیں مسدود کر دی گئی تھیں۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں ان لوگوں کے لیے لکڑیاں کاٹنے، پانی بھرنے یا پھر چھوٹی موٹی سرکاری ملازمتوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔''

''پنجاب میں (مثال کے طور پر) زیادہ تر تجارت، صنعت اور بنکاری پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ ان میں سے کسی میں بھی کوئی مسلمان نہیں ملتا تھا، سوائے کمتر درجے کی ملازمت کے۔

اچھی تنخواہوں والی ملازمتیں اور مالی منفعت کی جگہیں، ہندو سوسائٹی کی روایات کے مطابق، باہر والوں کے لیے نہیں صرف اہلِ خاندان، اپنی ذات برادری یا اسی قسم کے سلسلے والوں کے لیے ہی ہوتی تھیں۔''

''کچھ آنکھیں کھول دینے والے حقائق پیش کیے جاتے ہیں۔ تقسیم کے وقت ہندوستان میں پٹ سَن کے ایک سو گیارہ کارخانے تھے جن میں انہتر ہزار کھڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے صرف ایک ۵۰۰ کھڈی والا اور ایک ۱۵۰ کھڈی والے کارخانے آدمجی اور اصفہانی نام کے مسلمانوں کے تھے۔ سارے کارخانے کلکتے کے اطراف لگے ہوئے تھے، جب کہ اس علاقے میں ایک بھی کارخانہ نہیں تھا جو مشرقی پاکستان ہے۔ یہ علاقہ تو زراعت کے لحاظ سے بھی ابتر تھا۔''

''مغربی علاقے میں، جو اب مغربی پاکستان کہلاتا ہے، جہاں تک کپاس کا تعلق ہے تو یہاں ایک دوسرا معاملہ ہے۔ اس علاقے میں پارچہ بافی کے صرف دو کارخانے تھے، جب کہ ہمسائے ملک ہندوستان میں ۴۰۰ کارخانے تھے۔''

تقسیم سے قبل کے ہندوستان میں یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ مسلمان بینکاری اور بیمے کے معاملات کے قابل نہیں تھے۔ ایک طرف تو مسلمانوں کو ان دو صنعتوں میں موقع نہیں دیے جاتے تھے اور دوسری طرف ان کو نا اہل گردانا جاتا تھا، اس طرح ہندوؤں کی اجارہ داری جاری رہی۔ تقسیم سے قبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کا صرف ایک ہی بینک تھا — حبیب بینک جو ہندوؤں اور غیر ملکی بینکوں کے مقابلے میں معمولی سا تھا۔ تقسیم سے پہلے کے ہندوستان میں بیمے کی صنعت میں بھی حالات کچھ بہتر نہ تھے۔''

کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں بیمے کے صنعت کی کہانی پھولوں اور کانٹوں، امیدوں اور مایوسیوں سے عبارت رہی ہے۔ ملک کی پیدائش کے وقت یہاں مقامی پانچ اور غیر ملکی ۷۷ انشورنس کمپنیاں کاروبار کر رہی تھیں۔ چند برسوں بعد دو کمپنیوں، ایسٹرن فیڈرل یونین (ای ایف یو) اور حبیب انشورنس نے اپنے مرکزی دفاتر ہندوستان سے کراچی منتقل کر لیے۔ ای ایف یو نے کلکتے سے اور حبیب نے بمبئی سے۔

یہی وجہ ہے کہ بیمے کا بیشتر کاروبار تجربہ کار اور جدید غیر ملکی کمپنیوں کے پاس تھا جو اس ملک میں اپنی چیف ایجنسیوں اور شاخوں کے ذریعے کام کر رہی تھیں۔ نرخ نامہ اور اصولِ کار من و عن وہی تھے جو تقسیم سے پہلے رائج تھے جن کی دیکھ بھال بامبے انشورنس ایسوی ایشن کرتی تھی۔ فروری ۱۹۴۸ء میں ۷۹ کمپنیوں نے مل کر Insurance Association of Pakistan (IAP) کی داغ بیل ڈالی۔ ان میں سے صرف دو یعنی ای ایف یو اور حبیب، قومی کمپنیاں تھیں۔

سارا کاروبار نرخ نامے پر مبنی ہوتا تھا اور منافع بخش ہوتا تھا اس لیے کہ یہ سب چیف ایجنسیوں کی چھان پھٹک کے بعد لیا جاتا تھا اور اس میں کوئی اور حصے دار نہیں ہوتا تھا، اس طرح غیر ملکی کمپنیاں منافعے اور ری انشورنس پریمیم کی صورت میں خطیر رقمیں ملک سے باہر اپنے مرکزی دفاتر کو ارسال کر دیا کرتی تھیں۔ ملکی زرِ مبادلہ کے محدود وسائل کی قانونی مگر بے دریغ برآمد کو روکنے کے لیے حکومت نے ۱۹۵۰ء

میں سرکاری شعبے کے زیرِ انتظام ری انشورنس کا ایک منصوبہ بنایا اور ۱۹۵۲ء میں اس ادارے نے کام شروع کر دیا۔ اس ادارے کے پہلے سربراہ آسٹریلیا نژاد مسٹر پرنل (Purnell) بنے جو آسٹریلیا کی کمپنی کوئنز لینڈ انشورنس کے پاکستان میں نمائندہ سربراہ تھے۔ پرنل نے PIC کو کامیابی سے چلایا اور بعد کو ان ہی نے آدمجی انشورنس کمپنی کی بنیاد رکھی جس کے بارے میں آگے چل کر بات کی جائے گی۔ PIC کے اغراض و مقاصد کے پس منظر میں دو اہم نکتے کارفرما تھے: مقامی کمپنیوں کی مدد اور نئی کمپنیوں کی بنیاد رکھنے کی ہمت افزائی۔ اس کے عوض جنرل انشورنس کے تمام کاروبار میں سے PIC کو ری انشورنس کی صورت میں دس فی صد حصہ ملنا تھا۔ زرِ مبادلہ اور 'سیاسی' زاویے سے حکومت کے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ وہ اس ری انشورنس کے طریقے کا انتظام کرے۔ ۱۹۴۹ء میں کراچی کے بدنام زمانہ Thole Produce Yard میں جو کوئنس روڈ (موجودہ مولوی تمیزالدین خان روڈ) پر واقع تھا خوف ناک اور تباہ کن آتشزدگی کا واقعہ پیش آیا۔ یہاں برآمد کے لیے کپاس کی گانٹھوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اس آگ میں کئی کروڑ روپے کا مال جل کر راکھ ہوگیا جو اس زمانے کی اعتبار سے ایک بہت بڑی رقم کے مساوی تھا۔ ایسی صورتِ حال کے پیشِ نظر ظاہر ہے کہ غیر ملکی کمپنیوں نے، جن میں زیادہ تر برطانوی، آسٹریلوی، امریکی اور ہندوستانی تھیں، اس نوعیت کے خطرے کے بڑے حصے کی ذمے داری لینے سے احتراز شروع کر دیا جب کہ چند مقامی کمپنیاں خود میں اتنی بڑی ذمے داری اٹھانے کی سکت نہیں پاتی تھیں نہ ہی وہ اپنے ملک اور دوسرے سمندر پار ملکوں میں اس خطرے کی حصے داری کے لیے انتظام کر سکتی تھیں۔ اس بارے میں یہ بیان کرنا ضروری ہوگیا ہے کہ اس زمانے (یعنی پانچویں عشرے) کی مقامی کمپنیوں میں سب سے بڑی کمپنی ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی تھی مگر دوسری کمپنیوں کی طرح وہ بھی کپاس کی آتشزدگی سے ہونے والے نقصان کے صدمے سے دوچار تھی اور اس کو خود بھی مالی بحران کا سامنا تھا۔ اس زمانے میں ای ایف یو کے سربراہ نیوزی لینڈ کے باشندے Mr T Baxter تھے اور ان کے نائب ایک جرمن نژاد Mr E C Iven تھے جن کے خاکے پر مشتمل ایک باب اس کتاب کا حصہ ہے۔ Mr Baxter جنگِ عظیم دوئم سے قبل برما میں الیانز (Allianz) کے سربراہ تھے اور اتفاق سے اصفہانی خاندان سے ان کے قریبی مراسم تھے، جو ای ایف یو کے ایک بڑے حصے کے مالک تھے۔ میونخ ری (Munichre) کے ایک ڈائریکٹر جنگِ عظیم کے بعد کے زمانے میں ایشیا کے اپنے پہلے دورے پر کراچی آئے ہوئے تھے، جو اتفاق سے پہلے الیانز میں رہ چکے تھے اور Mr Baxter کے پرانے ساتھی تھے۔ دونوں نے نہ صرف پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے ایک شام ساتھ گزاری بلکہ اس بات کے امکانات پر بھی تبادلہ خیالات کیا کہ دونوں کمپنیاں، ای ایف یو اور میونخ ری ایک دوسرے سے کاروبار میں اشتراک کریں۔ المختصر میونخ ری نے ای ایف یو کی کاروباری امداد کی ہامی بھر لی اور اس طرح ایک مخصوص نوعیت کی باہمی طویل دوستی اور شراکت کی ابتدا ہوئی جس کو پچاس سال کا عرصہ ہو چکا ہے، جس کے بارے میں ہم آگے چل کر بات کریں گے۔

صدی کے پانچویں عشرے تک پاکستان کے بیمے کی صنعت پر غیر ملکی ادارے حاوی تھے۔ ایک اندازے کے مطابق ملک کے بیمے کے کاروبار کا اسّی فی صد ان ہی کے پاس تھا۔ انشورنس ایسوسی ایشن آف پاکستان میں بھی ان ہی کی اکثریت تھی، جس کے معتمد ایک غیر ملکی مسٹر اسٹیفورڈ تھے جن کا تعلق انگلستان سے تھا۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اندازِ کار تبدیل ہوتا گیا، پہلے آہستہ پھر تیز رفتاری سے۔ اس کی ابتدا PIC کے قیام سے ہوئی تھی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، قانونی اعتبار سے پاکستان میں ہونے والے تمام جنرل انشورنس کے کاروبار میں PIC کو دس فی صد حصہ ملنا تھا مگر بعد میں اس کو بڑھا کر ۱۹۵۸ء میں تیس فی صد کر دیا گیا۔ اس کا ایک بڑا حصہ ایک پولنگ اسکیم (Pooling Scheme) کے تحت واپس پاکستان کمپنیوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ اس طرح مقامی کمپنیاں انفرادی طور پر بھی مضبوط ہوئیں۔

ایک اور اہم قدم نیشنل کو انشورنس (National Co Insurance) اسکیم کا قیام تھا۔ یہ مقامی کمپنیوں کا ایک اشتراک تھا، ابتدا میں جس کے صرف چھ ارکان تھے، ای ایف یو جس کی سربراہ تھی اور اس میں آنے والے کاروبار کا ایک بڑا حصہ ای ایف یو کا تھا۔

PIC اس کی معتمد تھی حالاں کہ اس کا سارا کام ای ایف یو ہی کے ذمے تھا۔ دراصل یہ انتظام اور اس کے نتیجے میں کاروبار میں ملنے والی حصے داری ہی تھی جس نے مقامی کمپنیوں کو زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے میں مدد کی۔ اس انتظام کو مقامی کمپنیوں نے سراہا بھی اور کہیں کہیں سے اس پر تلخ اعتراضات بھی ہوئے۔ اس انتظام میں شامل بہت ساری چھوٹی چھوٹی کمپنیاں دراصل غیر ملکی ری انشورنس کمپنیوں کی شاخوں کے مماثل تھیں، لہٰذا ملکی بیمے کے صنعت کے لیے کوئی خاص فائدہ فراہم نہیں کرتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان ہی ''چھوٹی چھوٹی'' کمپنیوں کی ٹوٹ پھوٹ نے، جو دراصل پاکستان کی بیمے کی صنعت کے لیے 'برطانوی آقاؤں' کی چھوڑی ہوئی وراثت تھیں اور جو پاکستان میں ابھرنے والے بیمہ کاری کی صنعت کی ریڑھ کی ہڈی بنیں، اس کے معیار کو متاثر کیا اور کسی حد تک نقصان پہنچایا۔

اس کے باوجود پاکستان کی بیمے کی صنعت کے لیے یہ زمانہ مہم جویانہ اور ولولہ انگیز اور تھا اس لیے کہ اسی دور میں ملک میں معاشیاتی اور صنعتی ترقی تیز رفتاری سے ہو رہی تھی جس کو اطراف کے ممالک رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ پاکستان کی حکومت کو شروع دن ہی سے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ملک کی ترقی کے لیے ترقیاتی منصوبے بنانے ہوں گے اور اس پر سنجیدگی سے عمل کیا گیا تھا، جو ایک قابلِ تعریف اقدام تھا۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۵۱ء میں ایک چھ سالہ ترقیاتی منصوبے کا اعلان کیا گیا (جس کو عام طور پر کولمبو پلان کہا جاتا تھا)۔ یہ ایک نہایت لچک دار منصوبہ تھا جس کو آنے والے برسوں میں پھیلایا بھی گیا اور اس میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ اس لیے کہ اس کے پہلے نسخے میں معتبر شماریات کی غیر موجودگی میں کچھ قیاسات کیے گئے تھے۔ اس لحاظ سے یہ اس دور کے سرکاری افسران کا ایک دور رس اور اچھا کام تھا۔ ملک میں باقاعدہ اور مربوط ترقیاتی منصوبہ بندی کی ضرورت کے پیشِ نظر حکومت نے جولائی ۱۹۵۳ء میں منصوبہ بندی بورڈ کی بنیاد رکھ کر ایک اور دور رس قدم اُٹھایا۔ اس ادارے نے ہاورڈ مشاورتی گروپ کی مدد سے ۶۰-۱۹۵۵ء کے عرصے پر محیط ایک پانچ سال کا ترقیاتی منصوبہ ترتیب دیا۔ اس منصوبے کی ترتیب سے بہت کامیاب منصوبوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو ۱۹۷۱ء تک جاری رہا مگر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد اچانک بند ہو گیا۔

ان منصوبوں کا پہلا منصوبہ شاید نہایت اہم اور دور رس نتائج کا باعث ہوا تھا جس کی نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی منصوبہ بندی کے ماہرینِ معاشیات نے تعریف کی تھی۔ پہلا پانچ سالہ منصوبہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے آج بھی بہترین منصوبوں میں شمار کیا جاتا ہے جس کی نقل کوریا میں کی گئی اور نہایت کامیاب رہی۔ اتنی کامیاب شروعات اور اگلے چند برسوں کی زبردست معاشی ترقی کے بعد اس منصوبے کی تکمیل میں کیا رخنے پڑے، یہ ایک ایسا معما ہے جو سربرآوردہ ماہرینِ معاشیات، سیاست داں، سرکاری افسران اور تاجروں کے درمیان آج بھی موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ یقیناً ورلڈ بینک، انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ، پاکستان ڈیولپمنٹ کنسورشیم کے ممالک وغیرہ کو بھی اس بات پر حیرت ہوئی ہوگی اس لیے کہ بہ ظاہر یہ سب ادارے بھی پاکستان کی ابتدائی کامیابی سے متاثر ہوئے تھے جس سے اس ملک کے لیے ممکنہ طور پر 'ایشین ٹائیگر' بننے والے ممالک کی پہلی صف میں شامل ہونے کے امکانات دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے باوجود پچھلی صدی کے پانچویں عشرے میں بلکہ چھٹے عشرے میں بھی ہونے والی تیز صنعتی ترقی نے، جس میں پارچہ بافی، چینی، بناسپتی گھی، سیمنٹ وغیرہ کے کارخانے شامل ہیں، ملک کی بیمے کی صنعت پر مثبت اثرات مرتب کیے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ۱۹۵۰ء کے آس پاس ۸۱ بیمہ کمپنیوں میں سے صرف تین ایسی تھیں جن کے مالک پاکستان کے باشندے تھے۔ ای ایف یو جس کی بنیاد ۱۹۳۲ء میں کلکتے میں رکھی گئی تھی، 'حبیب' جو ۱۹۴۲ء میں بمبئی میں بنی، اور 'مسلم' جو ان دونوں سے قبل لاہور میں بنائی گئی تھی۔ ۱۹۶۱ء تک یہ صورتِ حال کافی حد تک تبدیل ہو چکی تھی۔ بیمہ کمپنیوں کی تعداد گھٹ کر ۶۳ ہو گئی تھی جس میں سے ۱۹ پاکستانیوں کی ملکیت، جب کہ ۴۴ غیر ملکی کمپنیاں تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کاروبار کا توازن بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ NCS کے قیام کے بعد پاکستانی اداروں کو کُل کاروبار کا تقریباً ایک تہائی حصہ ملنے لگا تھا، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آخر کار صورتِ حال مقامی اداروں کے حق

میں تبدیل ہو گئی۔ پچھلے سال، ۱۹۹۹ء، کے آخر تک کُل ۵۱ اداروں میں سے ۴۶ ادارے پاکستانیوں کی ملکیت ہو گئے تھے، یعنی صرف پانچ اداروں کی ملکیت سمندر پار کے مالکوں کی رہ گئی تھی۔

میں اس مسئلے کی مزید گہرائیوں میں جانا پسند نہیں کروں گا اس لیے کہ نہ تو میرے نزدیک یہ شماریات قابلِ اعتبار ہیں نہ میں پاکستان کی قابلِ فخر بیمے کی صنعت کے بارے میں ایسے کوتاہ بیں اور ایسے متعصّبانہ نقطۂ نظر سے اتفاق کرتا ہوں۔ اُس وقت کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی کے ایک افسرِ اعلیٰ، پاسپورٹ کے اعتبار سے ایک 'غیر ملکی' اور دلی اعتبار سے 'مقامی باشندے' کی حیثیت سے میں بڑے فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسے وقت میں بھی جب مقامی کمپنیاں، روایتی طریقوں سے کام کرنے والے اداروں کے مقابلے میں جن کی جڑیں گہری ہو چکی تھیں، کاروبار کے بڑے حصے کے حصول کے لیے جد و جہد کر رہی تھیں، بیمے کا کاروبار چلانے والی اہم شخصیات کے آپس کے تعلقات قابلِ فخر حد تک اچھے رہے تھے۔ اس کے برعکس صنعت کے اعلیٰ افسران کے، خواہ وہ کسی قومیت کے رہے ہوں، آپس میں کاروباری روابط، صارفین کی خدمت کو اولیت وغیرہ میں اشتراک قابلِ فخر رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ہوش مند شخص اس بات سے واقف تھا کہ پاکستانی مالکان کے اداروں کا یہ پیدائشی اور قومی حق ہے کہ وہ ابھرتی ہوئی صنعت کے پھیلاؤ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اور بیمے کے وہ تمام ماہر اور تجربے کار افسران جو پاکستان میں کام کرنے والے کثیر المملکتی اداروں سے تعلق رکھتے تھے اور جن سے میری واقفیت تھی، وہ بھی خوب جانتے تھے کہ ان ترقیاتی کوششوں کے کیا نتائج نکلنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے جدوجہد کو طویل کرنے کی تمام تر کوششیں کیں مگر یہ سب سیاست کے جوڑ توڑ سے مبرّا تھا۔ یہ سب، کسی قسم کی ناخوشگواری کے بغیر، نہایت دوستانہ ماحول میں ہو رہا تھا، ایسے ماحول میں جہاں ایک اقلیت آہستہ آہستہ اکثریت میں بدل جانے کو کوشش کر رہی تھی۔

۱۹۶۰ء میں جب میں نے اس مقامی ماحول میں قدم رکھا تھا اس وقت حالات تبدیلی کی موڑ پر تھے۔ اگرچہ اس وقت بیمے کے کاروبار کا بیشتر حصہ غیر ملکی اداروں کے پاس تھا مگر تبدیلی کی ہوا پاکستانی اداروں میں بھی پہنچ رہی تھی۔ انشورنس ایسوسی ایشن آف پاکستان کی مرکزی انتظامیہ کے صدر ایک مقامی انشورنس کے ادارے کے سب سے بڑے افسر بن چکے تھے اور اس کے معتمد ایک پاکستانی جناب معروف منتخب ہو چکے تھے۔ اور NCS کی معرفت سرکاری، نیم سرکاری اور دوسرے اداروں کے بیمے کا تقریباً تمام کاروبار اب مقامی اداروں کے ہاتھ آ چکا تھا۔ اور اس وقت بھی جب بڑے بڑے صنعتی ادارے غیر ملکی قرض سے لگائے جا رہے تھے اور قرض کی شرائط میں عام طور پر ایک شرط یہ بھی ہوتی تھی کہ کارخانے کا بیمہ پاکستان سے باہر سے ہونا تھا، بیمے کا خاصا بڑا حصہ قومی اداروں کو جاتا تھا پھر بھی بیمے کا بڑا حصہ ری انشورنس کمپنیوں کے ذریعے قرض دینے والے ملکوں کے 'بازاروں' میں پہنچ جاتا تھا۔ ایسی صورت میں بھی قومی اداروں کو کاروبار میں اچھا خاصا کمیشن مل جایا کرتا تھا۔

کم از کم سرکردہ مقامی بیمہ کمپنیوں کے درمیان کچھ اسی نوعیت کے دوستی کے جذبات پائے جاتے تھے۔ میرے ذاتی تجربات اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بارے میں نہ صرف پاکستانی بلکہ 'دوست غیر ملکی مبصرین' کا بھی خیال تھا کہ پاکستان کے ترقیاتی دور میں صنعتی ترقی کے اعتبار سے نہایت سرگرم اور بارآور زمانہ تھا۔ میری مراد پچھلی صدی کے چھٹے عشرے سے ہے۔ ای ایف یو سے قطعِ نظر جو اس زمانے ہی میں سب سے بڑا بیمے کا ادارہ بن چکی تھی، پریمئر، حبیب، نیو جوبلی اور کسی حد تک اس کاروبار میں داخل ہونے والی کمپنیاں آدمجی، سنٹرل، حتیٰ کہ نہایت فعال شخصیت مرحوم ملک صاحب کی سربراہی میں یونائیٹڈ انشورنس نے بھی خاصی کامیابیاں حاصل کر لی تھیں۔ اہم شخصیتوں میں نیو جوبلی کے سربراہ ماموں سجانی، حبیب کے سربراہ جناب محمد اور روسی ڈُباش، پریمئر کے اختر آزاد اور محمد چودھری وغیرہ تھے جو اس دور کی بیمے کی صنعت کے اہم ارکان اور آبرو تھے۔ مسٹر پرنل اور حمید سجانی نئی ابھرتی ہوئی طاقت 'آدمجی' کے اہم ترین کرتا دھرتا تھے، بعد میں پرنل کی جگہ محمد چودھری نے لے لی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو بیمے کی صنعت میں اعلیٰ درجے کی کاروباری مہارت اور معیار کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ میرا اور ان

لوگوں کا بے شمار ملاقاتوں، بحث مباحثے اور چھوٹے بڑے اہم اور غیر اہم کاروباری معاملات میں رابطہ رہا تھا۔ اگرچہ ہماری کاروباری ملاقاتیں اکثر اختلاف پر بھی ختم ہوتی تھیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہم بدمزگی اور غیر دوستانہ احساس کے ساتھ اُٹھے ہوں۔ مختلف رنگوں کی جلد رکھنے کے باوجود ہم سب ایک کلب کے ارکان کی مانند رہے تھے۔

ایک اور عظیم بیمہ کار شخصیت ایم اے چشتی کی تھی جس نے بیمے کی صنعت میں کاروباری مہارت کے لیے بہت جدو جہد کی اور بیمے کے مختلف ابعاد — تکنیکی اور انتظامی امور پر بہت کچھ لکھا ہے۔ بہتوں کی طرح انھوں نے بھی بیمے کی صنعت میں اپنا پیشہ ورانہ سفر ایسٹرن فیڈرل ہی سے شروع کیا تھا اگرچہ بعد میں وہ ایک اعلیٰ عہدے پر نیوجوبلی چلے گئے تھے۔ بعد میں انھوں نے کئی درمیانے اور چھوٹے درجے کے اداروں کی سربراہی کی ہے، اور درحقیقت وہ آج بھی کم و بیش اسی نوعیت کے ایک ادارے کے سربراہ ہیں۔ چشتی صاحب ہی نے پاکستان میں بیمے کی صنعت کی کامیابی پر اپنے تاثرات تحریر کرتے ہوئے انگریزی زبان کو ایک خوب صورت محاورہ 'Roses and Ruses' عطا کیا ہے۔ جہاں انھوں نے Ruses کا لفظ استعمال کیا وہاں ان کی مراد حکومت کی اس غیر ضروری دخل اندازی سے تھی جس کے ذریعے نجی ملکیت کے بیمے کے اداروں کو کئی بار مشکلات سے گزرنا پڑا تھا۔

میرا اشارہ اس نوعیت کے واقعات کی جانب ہے جب ۱۹۵۸ء میں (PIC) پاکستان انشورنس کارپوریشن کے لیے جبری ری انشورنس کو دس فی صد سے بڑھا کر تیس فی صد کر دیا گیا تھا، اور ۱۹۷۶ء میں باقی ماندہ ستر فی صد کا ایک چوتھائی مزید جبری ری انشورنس اسی ادارے کو دیے جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ یا جب بھٹو نے مارچ ۱۹۷۲ء میں زندگی کے بیمے کی پوری صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا تھا حالاں کہ صرف ایک برس قبل ہی بنگلہ دیش کے قیام کے ساتھ پاکستان کی بیمے کی صنعت تقریباً اپنا آدھا کاروبار گنوا چکی تھی۔ یا یکم جولائی ۱۹۷۳ء کو جب (NCS) نیشنل کو انشورنس کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا تھا اور نجی شعبے میں (NIF) نیشنل انشورنس فنڈ قائم کر دیا گیا تھا۔ اس کو بعد میں (NIC) نیشنل انشورنس کارپوریشن میں بدل دیا گیا اور اس کی وجہ سے نجی شعبے کی بیمہ کمپنیوں کو اس کاروبارِ بیمہ کے ایک بڑے حصے سے محروم کر دیا گیا تھا جو حکومتی اداروں کی بیمے کی ضروریات سے پیدا ہوتا تھا، اس لیے کہ سارا سرکاری بیمہ NIC کو دیا جانے لگا تھا۔ حکومت کے اس عمل پر نجی اداروں کی جانب سے کڑی تنقید ہوئی۔ NIC جو کہ اب کالعدم ہو چکی ہے، حکومتی اداروں کی اپنی اختراع تھی جس کے ذریعے بیمے کے زیادہ سے زیادہ کاروبار کو ملک ہی میں کھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ حکومت کا خیال تھا کہ اس قدم اور دور اندیشی کا زور شور سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ اس کے برعکس ان کو منھ کی کھانی پڑی اور ان کو وہ کچھ نہیں مل سکا جس کی منصوبہ بندی کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ، جیسا کہ نڈر اور بے باک چشتی کہتا رہا ہے، حکومت نے نجی کمپنیوں پر مزید محصولات کی صورت میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر رکھا تھا، یا بیمے کے قوانین پر نظر ثانی اور تبدیلیاں کرتے وقت صنعتوں کی انجمنوں کے مشوروں کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

جیسا کہ میرے قارئین جانتے ہیں، میں نجی شعبے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں نے اسی شعبے میں چالیس برس کے لگ بھگ کام کیا ہے جس کا بیشتر حصہ ان ایشیائی ملکوں میں بھی جو نجی شعبے پر یقین رکھتے ہیں اور ان ملکوں میں بھی جہاں بیمے اور بینکاری کی صنعتیں سرکاری انگوٹھے کے جبر تلے رکھی جاتی ہیں، گزارا ہے۔ لہٰذا میں ان نقطہ ہائے نظر سے ہم دردی کے جذبات رکھتا ہوں اور میں اس کے مخالف نظریے سے اتفاق کرنے کی کوشش بھی کروں تو میرا ضمیر اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا۔ عام انسانوں کی طرح حکومتیں بھی ماضی کی غلطیوں سے سیکھتی ہیں اور مستقبل کو سدھارنے کے لیے مختلف فیصلے کرتی ہیں۔ نجی شعبے میں زندگی کے بیمے کی اجازت دینا، خواہ وہ چھوٹے پیمانے ہی پر کیوں نہ ہو حکومتی پیش بینی ہے اور تعریف کی مستحق ہے۔ اور میں اس بات کا قائل ہوں کہ وہ وقت دور نہیں جب روشن خیال اور ترقی پسند سرکاری افسروں کو (جن کی ایک بڑی تعداد حکومتی شعبوں میں آج بھی موجود ہیں) احساس ہو جائے گا کہ پاکستان میں بیمے کی صنعت اتنی بالغ ہو چکی ہے کہ وہ یہاں کا مکمل کاروبار، سرکاری شعبے کا ہو یا نجی شعبے کا، خود سنبھال سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کا (ماضی کی غلطیوں کا) تدارک ڈرامائی انداز میں ایک دم ہو

جائے۔ نجی شعبے نے بھی پرانے ڈھرّے پر چلنے کے بجائے موجود حالات میں کام کرنے کا سبق سیکھ لیا ہے، جو دنیا کے دوسرے ممالک کے تجربے کے مطابق، اب مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ ماضی کے 'آہنی پردے' یا 'چلمن' کے پار ایک نظر ڈالنا یقیناً دیکھنے والوں کی آنکھیں پوری طرح کھول دے گا اور مجھے یقین ہے کہ بہت سے روشن خیال سرکاری افسران نہ صرف ان مناظر سے واقف ہو چکے ہیں بلکہ ان ہی خطوط پر سوچنے بھی لگے ہیں۔

پاکستان میں بیمے کی صنعت تجربے کار اور محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ وسیع پیمانے پر صنعت میں موجود منظم اداروں، پاکستان انشورنس انسٹی ٹیوٹ، انشورنس ایسوسی ایشن اور پہلی صف کی کمپنیوں کے تربیتی انتظامات کے طفیل دفتر کے ملازمین کے معیارِ کارکردگی میں نمایاں اضافہ ہو چکا ہے اور اس ترقی کا بین الاقوامی معیار سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ اوّل درجے کی جامعات سے فارغ ہونے والے بہت سے اعلیٰ سند یافتہ افراد بھی اب بیمے کی صنعت کو اپنے مستقبل کے لیے اختیار کر رہے ہیں اور امید کی جا سکتی ہے کہ یہ لوگ مستقبل میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوں گے۔ وہ سربرآوردہ شخصیتیں جن کا میں پچھلے صفحات میں نام لے کر تذکرہ کر چکا ہوں، اور وہ بے شمار افراد بھی، صفحات کے دامن کی کوتاہی کے باعث جن کا ذکر نہیں ہو سکا ہے، ان کارناموں کی روشن مثال ہیں جو بیمے کی صنعت نے ابھی تک کیے ہیں اور ان کی بھی جن کو وہ مستقبل میں انجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہے بشرطے کہ اس کی راہ میں سرکاری سرخ فیتہ نہ آئے اور مصنوعی رکاوٹیں نہ کھڑی کی جائیں۔ مجھے پورا اعتماد ہے کہ اس صنعت کا مستقبل گلابوں کی مہکار سے معطر ہے، بس اپنی کارکردگی کی صلاحیتوں اور اپنی ہمت پر یقین ہونا شرط ہے۔ بس یہی وہ اجزائے ترکیبی ہیں، میں نے اس کتاب میں بڑے پیمانے پر جن کی خاکہ نگاری کرنے کی کوشش کی ہے۔

آیئے اب ہم مستقبل سے ہٹ کر ذرا ماضی کے کچھ مخصوص ابعاد پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

(لندن ۱۹۳۱ء میں ) ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ کی پہلی میٹنگ ( دائیں سے ) ہائر اٹریڈنگ کمپنی کے شراکت دار عبدالرحمٰن صدیقی ، بی ایم کولنز اینڈ کمپنی لمیٹڈ ،لندن کے بی ایم کولنز ، اٹلس انشورنس کمپنی کے جنرل منیجر سی ایچ فالون اور ہائر اٹریڈنگ کمپنی لندن کے شراکت دار کے ایف حیدر

ہمارے پہلے جنرل منیجر مسٹر ایڈورڈ نورمن مینی تک

جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۹ء تک اپنے عہدے پر فائز رہے

اسٹینڈرڈ لائف بلڈنگ، ۳۲۔ ڈلہوزی اسکوائر، جنوبی کلکتہ میں ۱۹۴۵ء سے ای ایف یو کا مرکزی دفتر

# ای ایف یو کی تخلیق

جیسا کہ اکثر کہا گیا ہے، ای ایف یو ہندوستانی مسلمانوں کی بیمے کی صنعت کا گہوارہ رہی ہے، اسی طرح جیسے کہ بینکاری کے شعبے م
حبیب بینک۔ دوررس نگاہوں والے نوجوانوں کا ایک گروہ، جو علی گڑھ، لندن، آکسفرڈ یا کیمبرج کے ایام تعلیم کی دوستیوں پر مبنی تھا، مل بیٹھ کر
گڑھ تحریک کی بنیاد پر مسلمانوں کی سیاست پر غور کرتا ہے اور تجارت اور صنعت کے میدان میں اقلیتی گروہ کی کوتاہیوں پر ماتم کرتا ہے۔ اور ا
میں سے کچھ مسلم لیگ میں فعال ہو کے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں جد و جہد کرتے ہیں، یا کم از کم بالواسطہ اس سے تعاون کرتے ہیں۔ لی
عبدالرحمن صدیقی، کے ایف حیدر، شعیب قریشی، غلام محمد، شہزادہ حمید اللہ خان (جو بعد میں ریاست بھوپال کے نواب بنے) تحریکِ خلافت ک
زمانے میں ترکی جانے والے میڈیکل مشن والے ڈاکٹر ایم اے انصاری، اور ان ہی کے بھتیجے عبدالعزیز انصاری۔

ان نوجوانوں میں سے دو، صدیقی اور حیدر، نے مل کر ۱۹۲۰ء میں لندن میں ایک تجارتی ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور حیدر ا
کے منیجر بنے۔ لندن میں ان کے بیمے کے بروکر بی ایم کولنز کا زبردست خیال تھا کہ ہندوستان میں ایک بیمہ کمپنی کی بنیاد رکھی جائے اور
صرف ایک مستقل ربط کا سلسلہ ہو بلکہ آمدنی اور منافع کا بھی ذریعہ بنے۔ دونوں نے آپس میں صلاح مشورے کیے اور ان کا جواب 'ہاں' ہی
مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ ادارہ مسلمانوں کی ملکیت ہوگا اور وہی اس کو چلائیں گے بھی۔

اس دل چسپ کہانی کے پس منظر کو میں نے اس کتاب کے صفحات میں اور جناب روشن علی بھیم جی کی سوانح حیات میں بھی تفصیل
سے بیان کیا ہے۔ اس لیے میں اس کے دوبارہ بیان سے اپنے قاری کو بلا وجہ زیر بار نہیں کرنا چاہتا، صرف اتنا کہنا چاہوں گا اِس سے پاکستا
میں بیمے کی صنعت کے گہوارے ای ایف یو کی تخلیق کی ضرورت کو سمجھنے میں مدد ملے۔

عبدالرحمن صدیقی اور کے ایف حیدر نے ۱۹۳۱ء میں اٹلس نام کی ایک بڑی برطانوی بیمہ کمپنی اور بی ایم کولنز لائڈر بروکرز ک
تعاون سے ایک معاہدے کی یادداشت تیار کی جس میں کلکتے (ہندوستان) میں ایک بیمہ کمپنی بنانے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اٹلس کے ایک
اہم عہدے دار ای این منہی نک (E.N. Minhinik) کو نئی کمپنی بنانے اور پہلے سربراہ کی حیثیت سے اس کو چلانے کا فرض سونپا گیا
جس گروہ کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اس نے اس فیصلے کو سراہا اور دل و جان سے اس کی امداد کا وعدہ بھی کیا۔ اس حقیقت نے، کہ آغا خان ا
نواب بھوپال جیسی بڑی اور جانی پہچانی شخصیتوں نے اس کی سرپرستی قبول کی اس ادارے کو وقار بخشا۔ اور جیسا کہ میں نے جناب عبدالرحم
صدیقی کے خاکے میں تذکرہ کیا ہے، کمپنی کے حصص کی فروخت میں مشکلیں پیش آئیں۔ مگر سیاسی طور نہایت فعال گروہ کی انتھک محنت ا
اثر ورسوخ رائگاں نہیں گئے۔ جناب غلام محمد کی ذاتی کوششوں سے حیدرآباد اور بھوپال کی ریاستوں نے بہت سے حصص خرید لیے۔ سرو
ساسون سب سے بڑے غیر ملکی حصے دار بنے اور باقی بکنے والے حصص اصفہانی خاندان نے خرید لیے۔

بالآخر، بڑی مشکلوں کے بعد بنگال کے سب سے بڑے کاروباری اور صنعتی مرکز کلکتے میں ۲؍ستمبر ۱۹۳۲ء کو ایسٹرن فیڈرل یونین
رل انشورنس کمپنی لمیٹڈ کا وجود عمل میں آیا۔ اس کے ڈائریکٹروں میں نظام حیدرآباد کے حصص کے نگاہ دار کی حیثیت سے ریاست حیدرآباد
ے وزیرِ مالیات راجا اودھ نرائن بسار یا، ریاست بھوپال کے وزیرِاعظم سر اکبر حیدری اور عبدالرحمٰن صدیقی شامل تھے جو بورڈ کے صدر نشین کی
ہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے، اگر چہ ان کو باقاعدہ یہ منصب سونپا نہیں گیا تھا۔ ایک دل چسپ نکتہ قابلِ ذکر یہ ہے کہ اس دور میں ایسے
ے جاگیرداروں کا بڑا احترام اور ان پر اعتبار کیا جاتا تھا۔

اس طرح ہندوستان کی پہلی بیمہ کمپنی کی بنیاد پڑی جو نہ صرف مسلمانوں کی ملکیت تھی بلکہ اس کا انتظام و انصرام بھی مسلمانوں ہی
ے ذمے تھا اور ای ایف یو کی بے مثال داستان کا (جس کو ہم ای ایف یو ساگا کے نام سے پکاریں گے۔ مترجم) آغاز ممکنہ خطرات، خوش
یدوں اور نیک جذبوں کے ساتھ ہوا۔ اس داستان کی تاریخی اہمیت اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ اس کی شروعات میں جو ہستیاں، بالواسطہ
لا واسطہ، شامل تھیں وہ پاکستان کی تحریک میں بھی عملی طور پر شریک تھیں اور اس حوالے سے ان کا شمار پاکستان کی بنیاد رکھنے والوں میں بھی
تا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان شخصیتوں کے تذکرے کے ذریعے میں ای ایف یو کے معماروں کے گروہ کی انفرادی اور مشترکہ کوششوں پر روشنی
لنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ جیسا کہ کچھ شخصیتوں کے خاکوں کے ذریعے میں نے بیان کیا ہے، ای ایف یو کی تخلیق ایک مخصوص لوگوں
ے گروہ کی مشترکہ کوششوں سے ممکن ہوئی۔ اور ان سب ہی نے اس میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ بنیادی خیال تو لندن کے بروکر دوستوں نے
ے ایف حیدر کو دیا تھا جب کہ اس قسم کے معاملات میں زیادہ تجربے کار عبدالرحمٰن صدیقی نے اس کو آگے بڑھایا اور دوسرے دوستوں سے
ولہ خیالات کے بعد اس کو حقیقت کا جامہ پہنایا۔

کمپنی نے جنرل انشورنس کے کاروبار کی انڈر رائٹنگ شروع کی اور ۱۹۳۶ء میں بیمۂ زندگی کا کاروبار شروع کیا۔ تقسیم ہند سے
ے ایک سال قبل ہی اچھی خاصی کامیابی حاصل ہو چکی تھی۔ اس ادارے کو ہندوستان کے بیمے کی صنعت میں ایک مناسب اور قابلِ احترام
ام حاصل ہو گیا تھا۔ چیف ایگزیکٹیو کی حیثیت کے علاوہ ملازموں میں ہندوستان کی تمام قومیتوں، مسلمان، پارسی، ہندو وغیرہ سب ہی شامل
ے۔ کمپنی کے پہلے جنرل منیجر منی نک ۱۹۳۸ء میں ریٹائر ہو گئے اور ان کی جگہ ٹی این بیکسٹر نے لے لی جس پر وہ ۱۹۵۱ء تک فائز رہے۔ ان
ی جگہ جناب کے ایف حیدر نے زمامِ انتظام سنبھال لی۔

جناب صدیقی نے ۱۹۵۰ء میں ریٹائرمنٹ لے لی جب وہ مشرقی پاکستان کے گورنر کے عہدے پر فائز ہوئے اور جناب مرزا احمد
فہانی ۱۹۶۰ء تک کمپنی کے چیئرمین رہے۔ حکومت کے اعلیٰ کار پردازوں کے اہم رُکن ہونے کے باعث اصفہانی اتنے مصروف رہنے لگے
ے کہ انھوں نے چیرمین کا عہدہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی جگہ جناب کے ایچ شیرازی کا تقرر کروادیا۔ اصفہانی صاحب نے ایک جرمن
اد Mr E C Iven کا بھی ڈپٹی جنرل میجر کے عہدے پر تقرر کروادیا۔ یہ وہ شخص تھے جنھوں نے ای ایف یو کے بورڈ کو اس بات کا
ین دلادیا تھا کہ اس کمپنی کا مستقبل پاکستان میں ہے اور اس باعث (کمپنی کو پاکستان منتقل کرنے کا) فیصلہ کیا گیا تھا۔ لہٰذا ای ایف یو نے
ستان ہجرت کی اور اس کا صدر مقام مشرقی پاکستان کے شہر چاٹگام میں قائم کیا گیا جب کہ کاروبار کے لیے مرکزی دفتر کراچی میں بنایا گیا۔
ھ ملازمین کو ڈھاکے میں متعین کیا گیا، جو مشرقی پاکستان کا دارالحکومت تھا، تاکہ نئی اور ابھرتی ہوئی قوم کے مسائل کو حل کرنے کے لیے مقامی
ر پر انتظام بھی ہو۔

ان ساری تبدیلیوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ کمپنی نے ہندوستان میں اپنا کاروبار بالکل بند کر دیا تھا۔ جناب عبدالعزیز انصاری
، ہندوستانی حکومت کے انشورنس ڈپارٹمنٹ کی سربراہی سے فراغت کے بعد، عبدالرحمٰن صدیقی نے ای ایف یو کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر کی
یت سے ۱۹۳۴ء میں ہی تقرر کر دیا تھا اور ۱۹۵۰ء میں وہی کمپنی کے منیجر برائے ہندوستان اور سیلون (سری لنکا) بنائے گئے۔ یہ ۱۹۵۷ء کی

بات ہے جب برصغیر کے ان علاقوں سے ای یف یو کے رابطے منقطع ہوئے اس لیے کہ آخری بار ۱۹۵۶ء کی بیلنس شیٹ میں کلکتے اور مدراس کا نام شامل کیا گیا تھا۔

نیوزی لینڈ کے باشندے ٹام بیکسٹر اور قد آور جرمن اِروِن سی آئیون دونوں انتظامیہ کی ایک مضبوط اور ماہر جماعت کے اچھے سربراہ تھے جنھوں نے ایک بالکل نئے ماحول میں ادارے کی بنیاد رکھی اور اس کو کامیابی سے چلایا۔ یہ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے جب کمپنی کا دفتر میکلوڈ روڈ (حال چندریگر روڈ) پر واقع لائنز بلڈنگ میں تھا جو اب بھی موجود ہے اور اس میں امارات بینک کا دفتر ہے۔ جہاں ایک چھوٹی سی شاخ کام کررہی تھی وہیں کمپنی کے وسیع دائرۂ کار کے لیے ایک بڑا دفتر قائم ہوگیا۔ جناب اختر آزاد آتشزدگی کے بیمے کے کرتا دھرتا تھے اور جناب آغا رضا چیف اکاؤنٹنٹ، جو بعد میں PIDC کے اہم رُکن بنے، جناب ایس ایم معین الدین ایجنسی سیکشن کے انچارج، جناب ہاشمی میرین انشورنس کے منیجر، جناب تحسین احمد حادثاتی اور موٹر کے بیمے کے منیجر اور زندگی کے بیمے کے کارپرداز مشہور وصال الدین برادران کے سربراہ سب سے بڑے بھائی محمد وصال الدین تھے جن کی معاونت ان کے والد کرتے تھے، جو ایک طرح کے بزرگ رہنما تھے۔ ایک اور جرمن ہائنز ڈبلیوشوارز ۱۹۵۱ء میں ٹیم میں شامل ہوئے اور ان سب کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ کمپنی کامیابی کی راہ پر گامزن ہوچکی ہے۔ پاکستان میں کمپنی کا کاروبار ترقی کرنے لگا اور منافع بھی ہونے لگا۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے یکم جنوری ۱۹۵۲ء سے جناب کے ایف حیدر کمپنی کے سربراہ بن گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ملک تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ نئی بیمہ کمپنیاں وجود میں آرہی تھیں اور بیمے کے دفتری ملازمین کے لیے 'موج میلے' کا سماں تھا۔ جناب اختر آزاد کو اسٹیٹ بینک کے گورنر جناب زاہد حسین نے پریمئر انشورنس میں شمولیت پر راضی کرلیا، ای ایف یو کے لیے کام کرنے والے تین بھائیوں میں سب سے بڑے جناب وصال الدین امریکن لائف انشورنس کے سربراہ بن گئے اور وہ ای ایف یو میں اپنے پرانے ساتھیوں کے لیے سب سے طاقتور حریف بن کر ابھرے۔ جناب آغا رضا PIDC میں چلے گئے اور کئی دوسرے لوگ بھی نئی بننے والی کمپنیوں میں بہتر مواقع کے لیے قسمت آزمائی کرنے لگے۔ جناب کے ایف حیدر کے نائب اِروِن آئیون ۱۹۵۵ء میں جرمنی کی سب سے بڑی ری انشورنس کمپنی میونخ ری میں سینئر ڈائریکٹر کی حیثیت سے شمولیت کے لیے جرمنی چلے گئے۔ کسے خبر تھی کی ان سب تبدیلیوں کے پسِ پردہ بڑی کامیابیاں منتظر تھیں، خاص کر اس وقت جب ای ایف یو کے اپنے وجود کو خطرات لاحق نظر آتے تھے۔

کمپنی کے ان مشکل لمحات کے بارے میں اس کتاب میں تفصیل سے لکھا گیا ہے اور مزید سوالات کے جواب اپنے مرحوم دوست روشن علی بھیم جی کی سوانح حیات میں دیے ہیں جن کا خلاصہ درجِ ذیل ہے:

کاروبار کے لیے نئی راہیں تلاش کرنے کے لیے ای ایف یو کی انتظامیہ نے اپنے لندن کے ایجنٹ بی ایم کولنز کو کمپنی کی جانب سے لندن کی مارکیٹ میں کاروبار کرنے کا حکم دیا۔ کاروبار کے نتائج بھیانک نکلے مگر کراچی میں کسی کو اس کا فوراً علم نہیں ہوا۔ بعض وجوہات کی بنا پر لندن کے ایجنٹ نے تفصیلی حسابات بھی نہیں بھیجے تھے اور کمپنی نے بھی اس لیے خاموشی اختیار کر رکھی کہ نتائج کا کچھ حسابیاتی توڑ نکالا جا سکے۔ قصہ مختصر، ۱۹۵۰ء کے عشرے کے آخر تک یہ عیاں ہوگیا کہ لندن میں ہونے والے نقصانات کمپنی کی مالی استطاعت سے کہیں زیادہ تھے۔ اس لیے کچھ مشکل قدم اُٹھانے ناگزیر ہوگئے تھے۔ سب سے بڑے حصے دار ہونے کے ناتے اصفہانی خاندان کسی 'نجات دہندہ' کی تلاش میں تھا اور اس وقت عباس خلیلی جیسے پرانے تعلقات والے مشہورِ زمانہ سابق سرکاری افسر کام آئے۔ ان کے پرانے دوست راجا صاحب محمود آباد اور ایک اور سابق اعلیٰ سرکاری افسر جناب عثمان علی دونوں نے مل کر جناب روشن علی بھیم جی، انشورنس کی صنعت کے ایک تجربے کار ماہر اور پختہ کار سیاست داں کو، جیسا کہ میں پہلے کئی بار لکھ چکا ہوں، بیمے کی صنعت کے گھوارے ای ایف یو کی پتوار سنبھالنے پر راضی کرلیا تاکہ اس ادارے کو ممکنہ غرقابی سے بچایا جا سکے۔ ان لوگوں نے سب سے پہلے تو ادارے کے حصص کی ملکیت میں تبدیلیاں کیں۔

اصفہانی خاندان نے اپنے حصص کا ایک بڑا حصہ حبیب خاندان (ARAG Ltd) کو فروخت کر دیا۔ اس تبدیلی کے بعد خلیلی اور بھیم جی کسی معجزے کی تلاش میں عازم لندن و میونخ ہوئے۔

اور معجزہ رونما ہو گیا۔ ای ایف یو کے سابقہ جرمن افسران آئیون اور شوارز کام آئے، جو میری طرح میونخ ری کے اعلیٰ افسر ہو چکے تھے، اور روشن علی بھیم جی نے مل کر میونخ ری کے چیئر مین Dr. Alois Alzheimer اور ان کے معتمد Horts K Jannott کو، جو بعد میں ان کے عہدے پر فائز ہوئے، قائل کر لیا کہ اگر لندن کے مسئلے کو بخوبی حل کر لیا جائے تو ای ایف یو کی نئی انتظامیہ اس طوفان سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ Dr. Alzheimer نے فیصلہ کیا کہ ماضی میں ای ایف یو سے ری انشورنس سے کاروبار میں جتنا منافع میونخ ری نے کمایا ہے اس کا پچاس فی صد ان کو واپس کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ بغیر سود کے ایک بڑی رقم عاریتاً روشن علی بھیم جی کے لیے مختص کر دی جائے۔ اس سہولت کی موجودگی میں بھیم جی اور خلیلی لندن کنسورشیم کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ اس مسئلے کا ایک منصفانہ حل ہی ان کے حق میں ہوگا۔ Lloyds Brokers - Robert Bradfords کے سینئر ڈائریکٹر مسٹر ڈیوڈ ڈولن بالخصوص معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے اور یہ ان کی انتھک محنت اور معاملہ فہمی تھی جس کی وجہ سے کنسورشیم کے دوسرے ارکان ای ایف یو کی پیشکش پر راضی ہو گئے اور اچانک کمپنی کے افق پر چھائے ہوئے گہرے بادل چھٹ گئے۔ جو کچھ ایک قیامت اور تباہی کے مترادف نظر آ رہا تھا اب ایک بھیانک خواب میں تبدیل ہو گیا۔ اور یہ سب کچھ نسبتاً ایک قلیل عرصے میں ہو گیا۔ خلیلی اور بھیم جی نے کمپنی کی باگ ڈور یکم جنوری ۱۹۶۱ء میں سنبھالی تھی اور سال کے اختتام سے قبل ہی کمپنی کو منجدھار سے نکالنے کا کام انجام پا گیا۔

کمپنی کی نئی انتظامیہ نے وہ تاریخ رقم کرنا شروع کر دی جس کو اب عام طور پر ای ایف یو کی کامیابی کی داستان کہا جاتا ہے۔ ۱۹۷۲ء تک، جب بھٹو حکومت نے زندگی کے بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا تھا، ''عافیت کا نشان، ای ایف یو'' کا نعرہ ملک کے گھر گھر پہنچ گیا تھا۔ ای ایف یو کے بیمۂ زندگی کے کاروبار کی کامیابی نے اس کو، جاپان کے علاوہ، افریقی ایشیائی علاقے میں سب سے بڑا انشورنس کا ادارہ بنا دیا تھا۔

دو برس کے قلیل عرصے میں نجی ملکیت کی بیمہ کمپنیوں کی قامت اتنی کم ہو چکی تھی کہ یہ سوال کیا جانے لگا تھا کہ یہ ادارے باقی بھی رہیں گے یا نہیں۔ سب سے پہلے تو مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے وہاں کے کاروبار کا نقصان، پھر NIC کی تشکیل، اور اس پر مستزاد بیمۂ زندگی کو قومی ملکیت میں لینے کا حادثہ۔ ان سب نے مل کر بیمے کی صنعت کو نقصان پہنچایا مگر سب سے زیادہ نقصان ای ایف یو کو ہوا۔ جس طرح ہندوستان میں جنرل انشورنس کو بھی قومی ملکیت میں لیا گیا تھا، پاکستان میں کسی وقت ہو سکتا تھا۔ تعجب نہیں کہ ان وجوہات کی بنا پر اعلیٰ عہدے پر متعین کارکنان نے ملک چھوڑ کر باہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان نے صلاحیت کے میدان میں سب سے زیادہ نقصان اٹھایا مگر عجیب بات ہے کہ لوگوں نے اس میں بھی خیر کا پہلو تلاش کر لیا کہ اس طرح ملک چھوڑنے والے غیر ممالک میں جو زرِ مبادلہ کماتے تھے وہ اپنے ملک بھیجتے ہیں اور اس طرح ملکی معیشت مستحکم ہو رہی ہے۔

ایک بار پھر ای 'ایف یو ساگا' جیسی بنیاد پڑتی نظر آنے لگی۔ روشن علی بھیم جی ایک یقینی خطرے کی نشاندہی کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بیمۂ زندگی کی طرح جنرل انشورنس کی صورت میں بچے کھچے کاروبار کو بھی، جو نجی ملکیت میں باقی رہ گیا تھا، جلد یا بدیر کسی وقت بھی قومی ملکیت میں لیا جا سکتا ہے۔ وہ قومی ملکیت میں لیے جانے والی صنعتوں کی حالت اور ملک کی دوسری تجارتی پالیسیوں سے بھی نالاں تھے۔ اس لیے انھوں نے بھی اپنے پرانے کاروباری دوست جناب آغا حسن عابدی کے نقشِ قدم پر چلنے کی ٹھانی، جنھوں نے اپنے عرب دوستوں کی مالیاتی معاونت سے بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس کی بنیاد رکھ دی تھی جو بہت جلد ہی دنیا کے بڑے مالیاتی اداروں کی صف میں شامل ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ جناب بھیم جی نے عابدی صاحب کی تجویز قبول کرتے ہوئے برطانیہ، دبئی اور سعودی عرب میں بیمہ کمپنیوں کی بنیاد رکھ

دی۔ میں نے اس منصوبے کا تذکرہ جناب بھیم جی کی سوانح حیات میں تفصیل سے کیا ہے۔ اس کے بدقسمت اختتام کی کہانی کا سب کو علم ہے اس لیے اس کی تفصیل میں جانے سے گریز کیا جاتا ہے۔ بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس کی اچانک تباہی کی وجہ سے ان انشورنس کمپنیوں کو بھاری نقصان اُٹھانا پڑا اس لیے کہ ان کی رقوم عابدی صاحب کے بینک میں جمع تھیں۔ اس سانحے کی اور بھی وجوہات تھیں جن کو میں نے مناسب مقامات پر بیان کیا ہے۔

اس سانحے سے جو بچ رہا تھا وہ اس گروپ کے چیئرمین کی زبردست قوتِ ارادی تھی جو ای ایف یو کو دوبارہ ان بنیادوں پر استوار کرنے پر مصر تھی۔ لہٰذا نئے سرے سے ایک حوصلہ مند انتظامیہ منظم دی گئی اور جناب سیف الدین زومکا والا کو، جو پندرہ برسوں سے عرب امارات میں قائم گروپ کے اداروں میں منہمک تھے، کراچی واپس لا کر مینیجنگ ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ یہ ایک بڑا چیلنج تھا اس لیے ایک بڑے حصے کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد ای ایف یو جنرل کے نام سے باقی ماندہ کمپنی تنزل کا شکار تھی اور کاروباری معاملات میں آدمجی اوّل درجے کی کمپنی بن چکی تھی۔ پاکستان میں بیمے کی صنعت کے ایک طباع، ماہر اور تجربے کار شخصیت جناب محمد چودھری نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا جب ای ایف یو کے سربرآوردہ اعلیٰ افسران ملک سے باہر جا چکے تھے۔ انھوں نے کاروبار کے حالات کا غائر نظر سے تجزیہ کیا، اس کی کم زوریوں اور توانائیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنی بصیرت اور اپنی کمپنی کی ضروریات کے پیشِ نظر ایک دوررس حکمتِ عملی ترتیب دی۔ انھوں نے وہی کچھ کیا جو ۱۹۶۰ء سے ان کا شدید کاروباری حریف ادارہ ای ایف یو کرتا آ رہا تھا یعنی اپنے افسران اور کارکنان کو کامیابی سے تربیت یافتہ بنایا اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے اداروں، بالخصوص ای ایف یو، سے تربیت یافتہ اور ماہر کارکنوں کو اپنے ادارے میں بھرتی کیا اور اس طرح انھوں نے اپنے ادارے کو ایک نہایت فعّال اور اوّل درجے کا ادارہ بنا دیا تھا۔ آدمجی انشورنس نے ای ایف یو کی جگہ لے لی تھی اور بلا شرکتِ غیرے بیمے کے کاروبار میں اوّل درجے کی کمپنی بن چکی تھی۔ سال بہ سال دونوں اداروں کے درمیان، محمد چودھری اور ان کے 'سپاہیوں' کے حق میں، خلیج بڑھتی جا رہی تھی اور ای ایف یو سمیت پوری صنعت کو اعتراف کرنا پڑا کہ ان کو انشورنس کے ایک بنگالی فسوں گر نے چاروں شانے چت کر دیا ہے۔

سیف الدین زومکا والا اور روشن علی بھیم جی کی پاکستان واپسی کے بعد ہوا کا رُخ بدلنا شروع ہو گیا۔ ای ایف یو کے ڈھانچے میں تبدیلیاں کی گئیں اور کارکنوں کو جدید تربیت فراہم کرنے کی غرض سے پاکستان انسٹی ٹیوٹ کے صدر اور تربیت کے فن میں ماہر ملک کے نامور افسر جناب ارشد عبداللہ کو ایگزیکٹیو ڈائریکٹر بنایا گیا اور کمپنی کے سارے از کار رفتہ اور پرانے طریقوں کو دریا بُرد کر دیا گیا۔ نوجوان اور آگے بڑھنے کی صلاحیتیں رکھنے والے کارکنوں کو حوصلہ آزما عہدوں پر فائز کیا گیا اور ان کو جدو جہد سے پُر ذِمے داریاں سونپی گئیں۔ اس کی ایک بہترین مثال ڈپٹی ایگزیکٹیو ڈائریکٹر اور شمالی زون کے سربراہ قنبر حمید کی ترقی سے دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جو سب سے اہم بات ہوئی وہ یہ کہ اپنے باپ دادا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے نئی نسل نے اس ادارے سے اپنا مستقبل جوڑے رکھا اور اپنے بزرگوں کی طرح اس ادارے کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کو ایک عظیم ادارے میں بدلنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔

قنبر حمید ۱۹۵۱ء میں لاہور میں پیدا ہوئے اور ان کی ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ انھوں نے سینٹ انطونی ہائی اسکول سے اولیول کیا، گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے وہاں سے گریجویشن کیا۔ قانون داں بننے کا فیصلہ کیا اور پنجاب یونی ورسٹی سے ۱۹۷۲ء میں LLB کیا۔ ای ایف یو سے متعلق ان کی اوّلین یادوں میں وہ زمانہ ہے جب وہ اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور لاہور میں مال روڈ پر 'کوآپریٹو انشورنس بلڈنگ' میں واقع کمپنی کے دفتر جایا کرتے تھے۔ قنبر کے دادا شیخ عبدالحق اس زمانے میں لائف منیجر فار پاکستان کے عہدے پر فائز تھے۔ قنبر حمید کہتے ہیں، "اسکول کے بعد میں کمپنی کے دفتر چلا جایا کرتا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں میرے دادا کی ملازمت سے فراغت سے قبل ہی میرے والد کمپنی کے اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہو چکے تھے اور ۱۹۸۴ء میں ملازمت سے فراغت کے وقت وہ زونل اکاؤنٹنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔"

پنجاب یونی ورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد قنبر حمید نے ایک امریکی بین الاقوامی کمپنی میں ملازمت کر لی جو پاکستان میں تیل کی تلاش میں تھی۔ قانون میں مزید علم حاصل کرنے کی غرض سے لندن گئے جہاں انھوں نے یونی ورسٹی کالج لندن میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۸ء میں LLM (Master of Laws) کی ڈگری لی جس میں Majors in Insurance Law, Company Law, Civil Law, Anti Trust Laws شامل تھے۔ پاکستان واپسی پر انھوں نے کراچی اور لاہور کی اعلیٰ عدالتوں میں وکالت شروع کر دی۔ ای ایف یو سے اپنے پرانے رشتوں کی بنا پر وہ اس وقت کے مینیجنگ ڈائریکٹر جناب سلطان احمد سے کراچی میں گاہے گاہے ملاقات کیا کرتے تھے جن سے ان کے والد کے قریبی تعلقات تھے۔ ان ملاقاتوں کے دوران سلطان احمد بار بار قنبر حمید کو یاد دلایا کرتے تھے کہ ان کے 'خون میں انشورنس' ہے اور ان کو اپنے 'خاندان' میں جلد سے جلد شامل ہو جانا چاہیے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار جناب روشن علی بھیم جی نے بھی قنبر حمید سے اس موضوع پر بات کی تھی اور بالآخر انھوں نے ۱۹۸۵ء میں لاہور میں ای ایف یو کے برانچ منیجر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کر لی۔ قنبر حمید نے مجھ سے بات کرتے ہوئے کہا، "یہ ایک خوشگوار اتفاق ہے کہ نہیں کہ آج میں اسی کمرے میں بیٹھتا ہوں جس میں ای یف یو میں اپنے طویل عرصۂ ملازمت میں میرے دادا بیٹھا کرتے تھے۔ میرے کاندھوں پر ذمہ داریوں کا بڑا بوجھ ہے۔ مجھ کو اپنے مینیجنگ ڈائریکٹر کے اس اعتماد کی لاج بھی رکھنی ہے جو انھوں نے مجھ پر کیا ہے اس لیے مجھے دُگنی محنت کرنی پڑتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ میری کارکردگی کا میرے عظیم بزرگ کی کارکردگی سے مقابلہ بھی کیا جائے گا۔"

شمالی زون کے سربراہ کی حیثیت میں قنبر حمید اچھا کام کر رہے ہیں۔ کاروباری تعلق رکھنے والے اور دفتر کے کارکنان سب ہی ان کو پسند کرتے ہیں۔ ان کے دادا اور والد دونوں نے جو اعتماد حاصل کیا تھا وہی ان کے لیے ہمت افزائی کرتا ہے اور یہی بوجھ ہے جو ان کے کاندھوں پر رہتا ہے۔ ایسی ہی ایک اور مثال قنبر حمید کے عزیز ترین ساتھی شوکت سعید احمد کی ہے۔ شوکت بھی کمپنی کے ایک مشہور اعلیٰ افسر میاں سعید احمد کے صاحبزادے ہیں۔ اس قسم کی بہت سے مثالیں ہیں جہاں مشہور افسران کے بیٹے کمپنی میں شامل ہیں اور اگر کمپنی کی نظامِ مراتب کے معیار سے پرکھا جائے تو قنبر حمید ان سب میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی اور ایسی ہی بہت سی مثالوں ہی کی بدولت کمپنی تیزی سے ترقی کرتے ہوئے آج صنعت کی بلندیوں پر دوبارہ فائز ہوگئی ہے۔

زندگی کے بیمے کی صنعت میں نجی ملکیت کے اداروں کو کام کرنے کی اجازت ای ایف یو کی اپنے معیار پر واپسی کا ایک اور اہم سنگِ میل ہے۔ وہ ای ایف یو کے اس وقت کے چیرمین جناب روشن علی بھیم جی کی زندگی کا ایک اور خوشگوار دن تھا اس لیے کہ ایک مدت سے وہ حکومت کے مقتدر حلقوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے تھے کہ قومی ملکیت میں کام کرنے والے ادارے اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن آف پاکستان اور نجی ملکیت میں کام کرنے والے بیمے کے اداروں کے درمیان صحت مند مسابقت ہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے اس صنعت میں تیزی سے ترقی ہوگی اور یہ صنعت ویسی 'سماجی خدمت' کر سکے گی جس کی قوم کو ضرورت ہے۔ آخر کار کچھ دور رس اہل کارانِ حکومت نے ان کی تجویز کی حمایت کی۔

۸؍نومبر ۱۹۹۲ء کو ای ایف یو لائف پہلی لائف انشورنش کمپنی تھی جس کو کاروبار شروع کرنے کی اجازت دی گئی، جس کے بعد چار دوسری کمپنیوں کو بھی اجازت نامے جاری ہوئے۔ دو پاکستانی کمپنیوں، "نیو جوبلی" اور "میٹروپولیٹن" کو اور دو غیر ملکی اداروں "امریکن لائف" اور "کمرشیل یونین" کو۔ ای ایف یو لائف نے اپنا کاروبار "گروپ لائف انشورنس" پالیسیوں سے ۱۹۹۳ء میں شروع کر دیا۔

اس کمپنی کے سربراہ لائف انشورنس کے تجربے کار اور ماہر کارکن جناب طاہر جی ساچک اور ان کے چند قریبی ساتھی ہیں جنھیں انگلستان میں لائف انشورنس کا نہایت وسیع تجربہ ہے۔ نجی ملکیت کی بیمہ کمپنیوں میں کامیابی کے اعتبار سے ای ایف یو لائف سرِفہرست ہے۔ ڈاکٹر تاج الدین مانجی، میڈیکل ڈائریکٹر، عمر مرشد، کنسلٹنگ ایکچوئیری، بین الاقوامی شہرت کے حامل کنسلٹنٹ ایکچوئیری Michael Bell

جیسے نہات تجربے کار ماہرین کی معاونت کی بدولت ای ایف یو لائف نے ترقی کی ابتدائی منزلیں طے کرلی ہیں۔

'ای ایف یو جنرل' اور 'ای ایف یو لائف' دونوں مل کر اس پرانے، عظیم اور دوررس نگاہیں رکھنے والے ادارے کی نمائندگی کرتی ہیں ۱۹۷۲ء میں حکومت کی 'مداخلت' نے جس کو عارضی طور پر آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ یہ وہی حالات سے لڑنے کا جذبہ ہے، انشورنس کے تجربے اور، نئے زمانے کے تناظر میں، سارے پاکستان میں موجود گاہکوں کے مفاد کی پاسداری ہے جو ایک نئے نکھرتے ہوئے روپ میں جلوہ گر ہورہی ہے۔

نئی صدی کے آغاز سے ای ایف یو خاندان میں ایک نئے ادارے کا اضافہ ہوا ہے۔ انشورنس کے عالمی تناظر میں بڑے اداروں میں سے ایک، پانچوں برّاعظموں کے ستّر ملکوں میں انشورنس کے کاروبار میں مشہور جرمنی کا سب سے بڑا ادارہ Allianz Insurance Company کے اشتراک سے پاکستان کے عوام کو صحت کے بیمے کے فوائد مہیا کرنے کی غرض سے ایک ادارہ تشکیل کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ ۲۹/مارچ ۲۰۰۰ء کو معاہدہ ہو چکا ہے جس کے مطابق Allianz-EFU Health Insurance Company وجود میں آجائے گی۔ پاکستان میں بیمے کی صنعت کی تاریخ میں یہ بذاتِ خود پہلا واقعہ ہوگا کہ ایک مقامی کمپنی دنیا کے ایک بہت بڑے بیمے کے ادارے کے ساتھ اشتراک میں شامل ہورہی ہے۔ اور بلا شبہ ای ایف یو کی ۶۸ سالہ تاریخ میں ایک اور اہم سنگِ میل کا اضافہ ہوگا۔ دونوں اداروں کے درمیان معاہدے اس وقت طے پاچکے تھے جب ای ایف یو گروپ کے چیئر مین جناب روشن علی بھیم جی بقیدِ حیات تھے۔ یہ نئی تخلیق بھی اُسی فلسفے پر عمل پیرا ہوگی، کسی سمجھوتے کے بغیر جناب روشن علی بھیم جی تمام عمر جس پر کاربند رہے۔

۱۰/دسمبر ۱۹۹۸ء کو جب ان کا انتقال ہوا، انھوں نے کامیاب بیمہ کمپنیوں کا ایک گروپ ورثے میں چھوڑا۔ مجھے پورا یقین ہے جس کے کارپردازان کے پیشِ نظر وہی جذبہ ہے جو مرحوم کا نصب العین تھا۔ روشن علی بھیم جی اپنے ساتھیوں کی کارکردگی پر فخر کیا کرتے تھے اور انھیں یک گونہ انبساط کا احساس ہوتا تھا۔ ان سے میری تقریباً چالیس سالہ رفاقت اور ان کے ساتھیوں سے میرے تعلقات کی بنا پر، جو ای ایف یو کے پرچم کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں، مجھے پورا یقین ہے کہ وہ سب جناب بھیم جی کی خواہشات کی برآوری احترام اور تشکّر کے جذبے کے ساتھ کریں گے۔

روشن علی بھیم جی صاحب ای ایف یو کے زیرِ تربیت افراد کا سعید احمد صاحب سے تعارف کرا رہے ہیں

روشن علی بھیم جی صاحب غور و فکر کی کیفیت میں

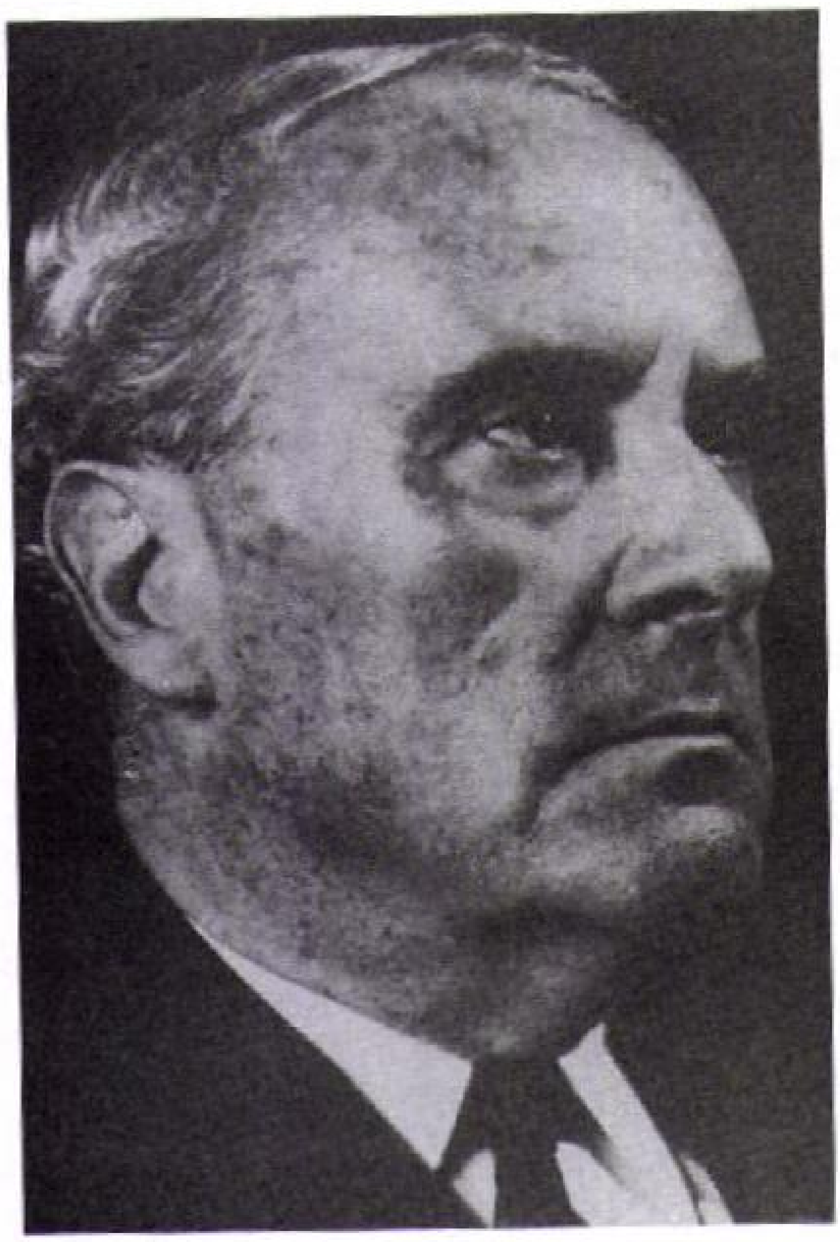

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۹ء تک میونخ ری انشورنس کمپنی کے
بورڈ آف مینجمنٹ کے چیئرمین ڈاکٹر الوس الزائمر

دو اچھے دوست اور رفقائے کار، روشن علی بھیم جی ۱۹۶۵ء میں مصنف کے ساتھ